الاعتراف والاستغفار من الذنوب من اعظم سنن النبی صلی اللہ علیہ وسلم

افادات مفیدہ

ملقب بہ

اعترافِ ذنوب

از

حضرت مصلح الامت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب قدس سرہ

تسہیل کردہ

حضرت مولانا محمد قمر الزمان صاحب الہ آبادی دامت برکاتہم
خویش ومجاز حضرت مصلح الامت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ

ناشران

مکتبہ دار المعارف الہ آباد
ادارہ معارفِ مصلح الامتؒ الہ آباد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کتاب سے متعلق ضروری معلومات

نام کتاب

اعتراف ذنوب : از حضرت مصلح الامت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ

مع اضافات نافعہ اعترافِ قصور : از حضرت مولانا محمد قمرالزمان صاحب دامت برکاتہم

تعداد اشاعت : ۲۱۰۰ صفحات : ۳۸۴

ناشران : مکتبہ دارالمعارف الٰہ آباد
وادارہ معارفِ مصلح الامتؒ الٰہ آباد

باہتمام : مولانا محمد عبداللہ قمرالزمان قاسمی الٰہ آبادی

کمپوزنگ : محمد عبیداللہ قمرالزمان ندوی ومولوی فیروز عالم قاسمی

سن اشاعت : رجب المرجب ۱۴۲۹ھ جولائی ۲۰۰۸ء

قیمت :

ملنے کے پتے:

☆......مکتبہ دارالمعارف الٰہ آباد، بی/۶۳۹ وصی آباد، الٰہ آباد، یوپی، ۲۱۱۰۰۳

☆......کتب خانہ فیض ابرار، نزد: نے بینا کلاتھ اسٹور، اسٹیشن روڈ، انکلیشور، ضلع بھروچ، گجرات

☆......مکتبہ فیضان قمر Time to Time دکان نمبر ۷ ایس ڈی چال، بہرام باغ روڈ، جوگیشوری ممبئی

☆......مکتبہ رحمانیہ، دارالعلوم عربیہ اسلامیہ بھروچ، محمود نگر کنتھاریہ، بھروچ، گجرات

☆......کتب خانہ انجمن ترقی اردو، جامع مسجد دہلی ☆ مکتبہ علمیہ محلّہ مبارک شاہ سہارنپور

☆......مکتبہ نعیمیہ ☆ زمزم بک ڈپو ☆ مسعود پبلشنگ ہاؤس، دیوبند ☆ مکتبہ نفیس، محمد علی روڈ، مالیگاؤں، ناسک

☆......الفرقان بکڈپو، ۱۱۴/۳۱ نظیر آباد، لکھنؤ، ☆ اشرفی کتب خانہ، ۱۷/۴۱ بخشی بازار، الٰہ آباد

فہرست مضامین ''اعتراف ذنوب''

فہرست مضامین ''اعتراف قصور''

عرض ناشر

بفضل اللہ وعونہ مکتبہ ''دارالمعارف الٰہ آباد'' نے بہت سی کتابیں، تراجم، سوانح حیات اور مواعظ وغیرہ کے نشر واشاعت کا شرف حاصل کیا ہے، جسے ارباب علم اور اہل ذوق حضرات نے بنظر تحسین دیکھا اور اپنی رائے عالی سے اہل مکتبہ کی ہمت افزائی فرمائی۔ **فجزاھم اللہ تعالیٰ**

الحمدللہ اس وقت بھی تصوف وسلوک کی اہم کتب تسہیل وتوضیح یا کتابت وطباعت کے مراحل سے گذر رہی ہیں، اللہ تعالیٰ ان تمام کتابوں کو امت کے درمیان پہنچانے کی توفیق مرحمت فرمائے، اور نافع بنائے۔ اور ہمیشہ اس کام کو جاری رکھنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین

پیش نظر مجموعہ جو درحقیقت مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب قدس سرہ کی کتاب ''اعتراف ذنوب'' اور مشفقی المکرّم حضرت والد صاحب دامت برکاتہم کی تصنیف ''اعتراف قصور'' کا مجمع البحرین ہے۔ ان دونوں کتابوں میں بندوں کو ایسی راہ دکھائی گئی ہے جو اللہ تعالیٰ سے قریب کرنے والی ہے۔ اس لئے کہ بندہ جب اللہ تعالیٰ کے حضور اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کا اعتراف کر کے ندامت کے ساتھ معافی مانگتا ہے اور دو قطرے آنسو بہا دیتا ہے تو اس وقت اللہ تعالیٰ اس کو قریب کر لیتے ہیں۔

اسی طرح انسان اپنے اعزہ واقرباء دوست واحباب وغیرہ کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کی بناء پر اعتراف قصور کر کے معافی کا طالب ہوتا ہے تو اس کی

نگاہ میں مقبول ہوجاتا ہے۔

ان دونوں کتابوں میں انبیاء کرام، اولیاء عظام، علماء وصلحاء کے اعتراف ذنوب اوراعتراف قصور کے عجیب وغریب واقعات پراثر انداز میں جمع کئے گئے ہیں جوانشاء اللہ سالکان راہ طریقت اور طالبان راہ جنت کے لئے مشعل ثابت ہوں گے۔

جملہ ناظرین کرام سے دعا کی درخواست ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے حضرت مشفقی المکرّم والد ماجد صاحب دامت برکاتہم کوصحت وعافیت کے ساتھ تادیر حیات بخشے اورشریعت وسنت کی ترویج واشاعت اورتصوف وسلوک کی تشریح ووضاحت کی مزید توفیق مرحمت فرمائے۔آمین

اب اخیر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اجر جزیل عطافرمائے ان تمام حضرات کو جنھوں نے علمی ومالی تعاون فرمایا ہو۔اوراس مجموعہ کو ہم سب کی زندگیوں میں انقلاب کا سبب وذریعہ بنائے۔آمین یارب العالمین

محمد عبداللہ قمر الزمان الہ آبادی
خادم مکتبہ دارالمعارف الہ آباد
ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ

تبصرہ

از: مشفق مکرم حضرت مولانا عبداللہ صاحب کاپودروی دامت برکاتہم[1]
سابق رئیس الجامعہ فلاحِ دارین ترکیسر ضلع سورت (گجرات)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عربی زبان کامشہور مقولہ ہے ''**الانسان مرکب عن الخطاء والنسیان**'' ہرفردِ بشر سے بھول چوک اورلغزش کاصدور ہوہی جاتا ہے، مگر جب وہ تواضع اورعبدیت اختیا کرتا ہے، اوراپنے گناہ اوراپنی خطاء کا اعتراف کرتا ہے، تواللہ تعالیٰ کامحبوب بن جاتا ہے۔

قرآن مجید نے جگہ جگہ انبیاء علیہم السلام کے بارے میں جوتذکرے فرمائے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضراتِ انبیاء علیہم السلام سے جہاں کہیں معمولی لغزش یاخلافِ اولیٰ کام کاصدور ہوتا تھا فوراًاللہ رب العزت کے دربار میں سربسجود

[1] حضرت مولانا عبداللہ صاحب کاپودری مدظلہ گجرات کے علمی وعملی ہر لحاظ سے ماشاء اللہ باکمال علماء میں سے ہیں۔کافی دنوں تک جامعہ فلاح دارین ترکیسر گجرات کے رئیس بھی رہ چکے ہیں۔اب آپ کا قیام کبھی اپنے وطن موضع کاپودرا ضلع سورت میں اورکبھی کنیڈا (ٹورینٹو) میں اپنے صاحبزادہ کے پاس رہتا ہے۔

آپ نے ''اعتراف ذنوب'' و''اعتراف قصور'' کے پڑھنے کے بعدجن تأثرات کا اظہار فرمایا ہے، میرے لئے انتہائی فرح وسرور کاباعث ہے۔اوراس کتاب کے وثوق کے لئے کافی وافی ہے۔انشاءاللہ اس سےعوام وخواص سب کے لئے مزید افادہ کا موجب ہوگا۔ **وماذالک علی اللہ بعزیز** محمد قمر الزمان الہ آبادی

ہوکر اعتراف فرما کر مغفرت کے طالب ہوتے تھے۔ سیدنا حضرت آدمؑ حضرت یونسؑ حضرت موسیٰؑ وغیرہم جلیل القدر پیغمبروں کے احوال اس پر دال ہیں، اور اسی عبدیت کے سبب ان کے مقام بلند سے بلند تر ہوتے تھے۔

انسان گناہ کا مرتکب ہو کر اس کا اعتراف نہ کرے، اس کو اپنی خطاؤں اور قصور پر رنج نہ ہو، تو وہ شیاطین کے زمرے میں شمار ہو جاتا ہے۔ اسی لئے سید الاولین والآخرین سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ماثورہ اور مسنون دعاؤں میں امت کو یہ تعلیم دی ہے کہ وہ ہر وقت اپنی خطاؤں اور گناہوں کا اعتراف کر کے اپنے مولیٰ کے سامنے عجز کا اظہار کرے، اپنی عبدیت اور بندگی کے ذریعہ اپنے رب کی رضامندی حاصل کرے۔

ہمارے اس پُرفتن دور میں جہاں مادیت کا غلبہ ہے، ہمارے اکابرین نے اس اہم سنت کی طرف متوجہ کرنے کے لئے مؤثر کتابیں تحریر فرمائیں ہیں۔ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب الہ آبادی نے ایک بہترین رسالہ ''اعترافِ ذنوب'' کے نام سے تحریر فرمایا ہے، جس کو بار بار مطالعہ کرنا چاہئے۔ حضرت مولانا قمرالزمان صاحب دامت برکاتھم نے اس کا ضمیمہ ''اعتراف قصور'' کے نام سے مرتب فرمایا ہے۔ جس میں حضرات انبیاء علیھم السلامؑ صحابہ کرامؓ اور کبارِ علماء وصالحین کے اعترافِ قصور کے مؤثر واقعات نقل فرمائے ہیں۔

یہ دونوں رسالے اس قابل ہیں مسلمانوں کی مجلسوں میں باقاعدہ سنائے جائیں، مدارس میں ان کی عصر بعد طلباء کو درساً درساً تعلیم کی جائے، تاکہ ان

میں تواضع اور عبدیت پیدا ہو، جس سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہو سکے۔

مولانا محمد احمد پرتاب گڑھیؒ کے یہ اشعار کس قدر عمدہ اور دل کو تڑپانے والے ہیں!

کبھی طاعتوں کا سرور ہے، کبھی اعتراف قصور ہے
ہے ملک کو جس کی نہیں خبر، وہ حضور میرا حضور ہے
جو ہے اہل عشق کی ابتدا، جو ہے اہل عشق کی انتہاء
میں بتاؤں احمد بے نوا، میرا اعتراف قصور ہے

اللہ رب العزت پیر طریقت حضرت مولانا محمد قمرالزمان صاحب دامت برکاتھم کی خدمات جلیلہ کو شرفِ قبول عطا فرمائے، کہ اس قحط الرجال کے زمانے میں آپ کی ذات والا بہت بڑی نعمت ہے، اللہ تعالیٰ صحت وعافیت کے ساتھ آپ کے سایۂ پرفیض کو تادیر قائم رکھے۔ آمین ثم آمین

فقط والسلام

احقر عبداللہ غفرلہ کاپودروی

۱۳ جمادی الاولی ۱۴۲۹ھ، ۱۹ مئی ۲۰۰۸ء

تہنئت

مخدوم مکرم حضرت الحاج الحافظ ڈاکٹر صلاح الدین[ا] صاحب صدیقی مدظلہ العالی
خلیفہ خاص حضرت مصلح الامتؒ و مدیر رسالہ ''معرفت حق'' الہ آباد

بسم اللہ الرحمن الرحیم. نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

یہ حقیر کمترین صلاح الدین احمد عزیزم مولانا محمد قمر الزمان سلمہ کو مبارکباد پیش کرتا ہے کہ وہ ''اعتراف ذنوب'' مؤلفہ شیخ زمن حضرت مصلح الامتؒ کی

[ا] مکرم ڈاکٹر صاحب مدظلہ کا مختصر تعارف یہ ہے کہ آپ کی ولادت موضع بہتری ضلع غازیپور میں ہوئی، آپ کا بچپنا اپنے والد داروغہ نجم الدین صاحب کے ساتھ دیوبند، سہارنپور، تھانہ بھون کے اطراف میں گذرا جس کی وجہ سے اس زمانہ کے علماء و مشائخ کی خدمت میں جانے کی سعادت حاصل ہوئی، بلکہ بعض عربی کتابیں بھی دارالعلوم دیوبند میں پڑھیں خصوصاً حضرت حکیم الامتؒ کی خدمت میں بلکہ اندرون خانہ بھی آتے جاتے رہے۔ اس کے بعد طبیہ کالج الہ آباد سے فراغت حاصل کی۔ اور جب حضرت مصلح الامتؒ ۱۹۵۷ء میں الہ آباد آئے تو ہمہ وقت مثل سایہ کے اخیر وقت تک بلکہ سفر آخرت تک خدمت اقدس میں رہے۔ حضرت مصلح الامتؒ سے تعلق کے کچھ ہی دنوں بعد تحریری طور پر بیعت کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء
ماشاء اللہ آپ نے بخشی بازار روشن باغ مکان نمبر ۲۳ کی خریداری میں خاص خدمت انجام دی اسی طرح رسالہ معرفت حق کے اجراء کی بھی آپ کو سعادت نصیب ہوئی۔ جس کا فیض اب بھی جاری و ساری ہے، غرض حضرت ڈاکٹر صاحب نے حضرت مصلح الامتؒ سے خوب ہی خوب فیض اٹھایا۔ جس پر آپ کے یہ پر کیف اشعار دال ہیں ؎

مجھ کو ہر شئی میں نظر آتا ہے اللہ اللہ ‌‌ ‌ صدقۂ شیخ زمن شاہ وصی اللہ
بھر دیا قلب میں انوار کا اک سیل رواں ‌ ‌ کیسی حکمت و دانائی ہے اللہ اللہ

محمد قمر الزمان الہ آبادی ۱۳؍ رجب ۱۴۲۹ھ ادارہ معارف مصلح الامت

طباعت کا ارادہ کر رہے ہیں مزید اس کی کسی قدر توضیح و تسہیل بھی کی ہے، اللہ اس عزم کو پایۂ تکمیل تک پہونچائے اور قبول فرمائے۔ آمین

ماشاء اللہ ملک و بیرون ملک میں مولانا سلمہ سے تصنیف و تالیف کے علاوہ تعلیم و تزکیہ نفوس کا کام بھی ہو رہا ہے اور طالبین اس کو قبول فرما رہے ہیں۔ اللّٰھم زد فزد

مجھے خوشی ہے کہ مولانا کا رہائشی مکان جو جامع مسجد وصی آباد کے سامنے ہی ہے اس لئے فجر کی نماز وہاں ہی ادا کرتے ہیں اور اشراق تک مسجد کے شمالی حجرہ میں بیٹھتے ہیں جس کا انتظام عزیزم مولوی سیف الرحمٰن سلمہ نے کر دیا ہے اس کی وجہ سے عام لوگوں کے لئے ملاقات کی بھی سہولت ہوگئی ہے۔ نیز مولانا کا جمعرات کی نماز فجر کے بعد تفسیر سنانے کا بھی معمول ہے جس میں طالبین شریک ہوتے ہیں۔

مولانا سلمہ کی انھیں صلاح و صلاحیت جو حضرت مصلح الامتؒ کے زمانہ سے دیکھ رہا تھا جس کی بناء پر آپ سے حضرتؒ ہی کے زمانہ سے موانست و محبت تھی چنانچہ ایک مرتبہ مولانا کی بیحد یاد آئی اسی وقت بے ساختہ و برجستہ یہ اشعار زبان پر آ گئے ؎

آ رہے ہو یاد تم قمر الزمان ‌ ‌ اے محبّ خاص اے روح رواں
فیض تیرا ہر طرف جاری رہے ‌ ‌ نکتہ سنج و نکتہ فہم و نکتہ داں

اسی بناء پر حضرت مصلح الامتؒ کے رحلت فرمانے کے بعد آپ کو توکلاً علی اللہ خلافت اور چاروں سلسلوں میں تحریری طور پر بیعت کی اجازت دیا۔ اللہ تعالیٰ آپ سے خوب کام لے اور قبول فرمائے اور آپ کے ذریعہ علوم تصوف اور سلاسل صوفیاء کو مزید فروغ عطا فرمائے۔ آمین ‌ ‌ والسلام

صلاح الدین احمد صدیقی
۲۰؍ فروری ۲۰۰۸ء

اعتراف ذنوب اور انقلاب عقیدہ

ازمکرم جناب الحاج انیس احمد پرخاصوی صاحب زید مجدہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"اعتراف ذنوب" کتاب کے مطالعہ سے قبل اللہ تعالیٰ کی الوہیت وربوبیت کا استحضار میرے دل ودماغ کی تختی پر ہلکی سی لکیر کی طرح تھا لیکن انبیاء کرام اور اولیاء اللہ کی عظمت اوران کے تصرفات اور حاجت روائی اور مشکل کشائی کا عقیدہ پورے دل ودماغ پر چھایا ہوا تھا۔ دل کے کسی گوشے میں بھی یہ خیال نہ آیا تھا کہ ان حضرات نے دنیا میں رہ کر کبھی آخرت کی بھی فکر کی ہوگی۔اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے اللہ تعالیٰ کے حضور گریہ وزاری کو اپنا معمول بنایا ہوگا۔

معتبر کتب اور روایتوں سے حضرت مرشدی مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ نے اس کتاب میں بارگاہ خداوندی میں انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام کی گریہ وزاری کے واقعات پیش فرمائے ہیں اور یہ ثابت کیا ہے کہ بندہ جتنا زیادہ اللہ کے قریب ہوتا ہے اتنا ہی زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہوتا ہے۔ چونکہ سب سے زیادہ اللہ کی معرفت اور قرب الٰہی انبیاء کرام کو حاصل ہے، یہی وجہ ہے کہ سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والی ذات انبیاء کرام ہی کی ہے۔ انبیاء کرام نے اس انداز سے اللہ کی بارگاہ میں دعائیں مانگی ہیں، جیسے کوئی گنہگار بندہ اللہ کے سامنے روتا اور گڑگڑاتا ہے۔ اللہ کے نیک بندے اور اولیاء کرام نے بھی نبی کی سیرت وسنت سے سبق لیتے ہوئے اسی گریہ وزاری کو اپنا شعار بنالیا کہ اللہ کی رضا کے حصول کا طریقہ یہی ہے۔ مذکورہ

کتاب کے باب گریہ وزاری کے تأثرات کو ناچیز کے اس شعر میں ملاحظہ فرمائیں۔ ؎

جو ہے عین سنتِ انبیاء اسے حرزِ جان بنالیا
مرے کام آیا جو برملا مرا اعتراف ذنوب ہے

اس کتاب کے مطالعہ سے مجھے انبیاء کرام اور اولیاء عظام کی صحیح معرفت حاصل ہوئی۔ اور ساتھ ہی ساتھ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کی شان بے نیازی کی بھی معرفت الحمدللہ حاصل ہوئی۔اور دل اللہ کے خوف سے لرز اٹھا۔

کتاب کا مطالعہ خلوص اور نیک نیتی سے شروع کیا تو مجھے اس کتاب سے جو فیض پہنچا اور میرے عقیدے میں جو تبدیلی واقع ہوئی اس کی جھلک ناچیز ہی کی زبان سے نکلے ہوئے چار مصروں میں ملاحظہ فرمائیں۔ ؎

جہاں کا پالنے والا خدا حاجت رواسب کا
وہی خالق ہے سب کا اور وہی مشکل کشا سب کا
ولی ہوں یا کہ پیغمبر شہید ہوں یا کہ ہوں غازی
غرض مخلوق سب اس کی اور وہ ہے خدا سب کا

اس کتاب میں صحابۂ کرام اور بزرگان دین کے واقعات کو سامنے رکھ کر طریق وتصوف کے دیگر گوشوں پر بھی حضرتؒ نے کلام فرمایا ہے جو انتہائی مؤثر اور سبق آموز ہیں۔ چنانچہ باب طریق وتصوف سے متأثر ہو کر ناچیز نے ایک شعر اور کہا ہے جسے شاید کتاب کا خلاصہ کہا جا سکتا ہے۔ معذرت کے ساتھ پیش خدمت ہے۔ ؎

بندگی عاجزی ہی سب سے بڑی دولت ہے   کشف مانگو نہ بزرگی نہ کرامت مانگو

میرے شیخ ومرشد حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے اور ان کے درجات کو بلندتر فرمائے جن کی برکت سے مجھے صحیح دین ملا اور اہل حق کی جماعت سے وابستہ ہوگیا۔ اللہ پاک آخری سانس تک دین حق پر قائم رکھے۔ آمین

اس مبارک تمنا اور آرزو کو اس حقیر نے ایک شعر میں بطور دعا پیش کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

انیس رہنا ہمیشہ قائم ہر ایک موقعہ پہ دین حق پر
اگرچہ اس راہ کے سفر میں ہزار فتنے اٹھا کریں گے

مرشدی حضرت مولانا محمد قمرالزماں صاحب دامت برکاتہم نے حضرت مصلح الامت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ کی کتاب ''اعتراف ذنوب'' کی افادیت کے پیش نظر دوبارہ شائع کرنے کا عزم مصمم فرمالیا تو غالباً دوسرے ہی دن حضرت مولانا نے ہم لوگوں سے فرمایا کہ میرے دل میں یہ بات آرہی ہے کہ اسی کتاب کے ساتھ ''اعتراف قصور'' کے نام سے ایک رسالہ شامل کردیا جائے تو بہت مفید ہوگا، جس کے مضامین اس انداز کے ہوں گے۔ چند صفحات ''اعتراف قصور'' کے جو تحریر فرما چکے تھے بطور نمونہ ہم لوگوں کو سنایا تو مجھے محسوس ہوا کہ یہ رسالہ الہامی ہے اور ''اعتراف ذنوب'' کی تشریح بھی ہے۔

اس موقعہ پر ایک اہم بات اور عرض کردینا مناسب سمجھتا ہوں وہ یہ کہ حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب جامیؒ محتاج تعارف نہیں مجھ سے فرمایا کہ انیس بھائی میری صحت جواب دے رہی ہے اور کام بہت ہے، لہٰذا اب یہ

ارادہ کرلیا ہے کہ حضرتؒ کی جو بھی تعلیمات وملفوظات وغیرہ دستیاب ہوتے جارہے ہیں ترتیب کا لحاظ کئے بغیر ان سب کو شائع کردوں، بعد اس کے کوئی اللہ کا بندہ جسے توفیق ہوگی ان بکھرے ہوئے موتیوں کو یکجا کرکے سلیقہ اور حسن اسلوبی کے ساتھ شائع کردے گا۔

اور حضرت مصلح الامتؒ کبھی یہ فرمایا کرتے تھے کہ جو باتیں بیان کررہا ہوں تو میری آواز کمرہ سے بھی باہر نہیں جارہی ہے مگر اللہ کو قدرت ہے کہ سارے عالم میں اس کو پہونچادے۔ چنانچہ حضرتؒ کے علوم ومعارف کو حضرت مولانا محمد قمرالزماں صاحب دامت برکاتہم کے ذریعہ پہونچارہے ہیں۔

اور ایک بات معلوم کرکے مزید خوشی ہوئی کہ حضرت مولانا کا ارادہ ہے کہ حضرت مصلح الامتؒ کے ملفوظات ومقالات کو جو رسالہ'' معرفت حق ووصیۃ العرفان'' میں بکھرے ہوئے ہیں ان کو یکجا کرکے قدرے توضیح وتسہیل کے ساتھ ''معارف مصلح الامت'' کے نام سے شائع کیا جائے۔ چنانچہ الحمدللہ یہ کام شروع ہوچکا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی تکمیل فرمائے اور حضرت مصلح الامتؒ کے علوم ومعارف کو سارے جہان میں عام وتام فرمائے۔ آمین

اللہ تعالیٰ حضرت دامت برکاتہم کو بھی تادیر قائم رکھ کر ہم لوگوں کو ان سے مستفیض ہونے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین

انیس احمد انیسؔ پرخاصوی
۱۴؍رجب المرجب ۱۴۲۹ھ

تأثر

از: مولانا مفتی جمیل احمد صاحب نذیری

رکن مجلس علمی آل انڈیا فقہ اکیڈمی نئی دہلی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

امابعد! ذنوب وقصور، انسانی شرست ومزاج میں داخل ہے، اور کسی انسان سے اس کا صدور محل تعجب نہیں، لیکن محل تعجب یہ ہے کہ اعتراف ذنوب اور اعتراف قصور نہ ہو۔ اور عجب و پندار میں مبتلاء ہوکر نہ گناہوں سے توبہ کرے، نہ گناہوں کا اعتراف کرے۔

عجب و پندار میں پڑنا اور اعتراف ذنوب وقصور نہ کرنا ابلیس اور پیروان ابلیس لعین کی صفت ہے۔ اور تواضع وانکساری، ذنوب پر توبہ، رجوع الی اللہ اور قصور کا اعتراف انبیاء کرام اور صلحاء عظام کے نقش قدم پر چلنے والوں کی صفت ہے۔

اس حقیقت کو مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب الٰہ آبادیؒ نے پورے شرح وبسط کے ساتھ زیر نظر افادات ''اعتراف ذنوب'' میں بیان کر دیا ہے۔ اسی کے ساتھ اس کی مزید تشریح مرشدی ومخدومی حضرت مولانا شاہ محمد قمرالزمان صاحب الٰہ آبادی دامت فیوضہم العالیہ کے ہم رشتہ ضمیمہ ''اعتراف قصور'' سے ہوگئی ہے۔ دونوں کتابوں کا یہ مجموعہ سالکان طریق کے لئے بہترین راہبر اور رہنما ہے۔ اور منزل سلوک تک پہونچنے کا سہل اور آسان طریقہ۔

دونوں کتابوں کی یہ خصوصیت ہے کہ ان میں صرف اعتراف ذنوب اور اعتراف قصور کی تعلیم وتلقین ہی نہیں ہے بلکہ انبیاء کرام، رسل عظام اور صلحاء امت کے احوال واعمال سے ان کے عملی نمونے بھی پیش کردیئے گئے ہیں جو اصل مقصود ہیں۔ ان میں بھی حضرت سیدالرسل، فخر موجودات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے اس طرح کے نمونے دل ودماغ کی دنیا میں ہلچل ڈالنے کے لئے کافی ہیں۔

اعتراف ذنوب کے ذریعہ ماضی میں بھی بہت سے لوگوں کے دل کی دنیا بدلی۔ اور اب حضرت مرشدی دامت فیوضہم العالیہ کی تسہیل وترتیب جدید اور آپ کے ضمیمہ ''اعتراف قصور'' بہتوں کے لئے انقلاب تازہ کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔ دل بدلیں گے، اذہان واحوال کے بدلنے پر آمادہ ہوں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ

اگر چہ احقر اس کا اہل نہیں کہ حضرت مصلح الامت علیہ الرحمہ کے افادات اور حضرت مرشدی ومخدومی دامت برکاتہم کی کسی کتاب پر تعارفی کلمات لکھے، لیکن حضرت مرشدی مدظلہ کے حکم پر از راہ سعادت یہ چند سطریں تحریر کر رہا ہوں۔

اللّٰھم تقبل منا انک انت السمیع العلیم وتب علینا انک انت التواب الرحیم

جمیل احمد نذیری غفرلہ

جامعہ عربیہ عین الاسلام، نوادہ، مبارکپور

اعظمگڈھ، یوپی

۱۴/صفرالمظفر ۱۴۲۹ھ یوم جمعہ

وارد حال خانقاہ حضرت مرشدی دامت برکاتہم الٰہ آباد

پیش لفظ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

یہ پورا مضمون مجموعہ ہے حضرت مصلح الامتؒ کے ان افادات کا جسے رمضان المبارک ۱۳۸۳ھ میں بیان فرماتے رہے ،اس کو حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب جامیؒ نے حسن ترتیب کے ساتھ جمع فرمادیا اور اس نے ایک رسالہ کی شکل اختیار کرلیا اس سے پہلے رمضان المبارک ۱۳۸۲ھ میں تلاوت کلام پاک پر مضامین بیان فرماتے رہے جن کو اس حقیر نے خاص ترتیب کے ساتھ جمع کردیا اور حضرت مصلح الامتؒ کو حرفاً حرفاً سنایا حضرت بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ اب یہ ایسی کتاب تیار ہوگئی ہے کہ اس سے بہت سے لوگ صاحب نسبت ہوجائیں گے۔اس لئے اس کو تلاوت قرآن کے نام سے شائع کیا گیا۔

یہی حال اس رسالہ اعتراف ذنوب کا بھی ہے کہ اگر بغور مطالعہ کیا جائے اور عمل پیرا ہوا جائے تو انشاء اللہ طریق عیاں ہوجائے گا اور آدمی کے لئے سلوک آسان ہوجائے گا اور منزل مقصود تک پہونچ جائیگا۔ واللہ الموفق

خوشی کی بات ہے کہ حضرت مصلح الامت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ نے اپنے اس رسالۂ نافعہ کا نام "**الاعتراف والاستغفار من الذنوب من اعظم سنن النبی صلی اللہ علیہ وسلم**" رکھا۔ یہ نام ہی رسالہ کے پورے مضامین پر حاوی ہے۔اور ظاہر ہے کہ اپنے مضامین کا تعارف صاحبِ

مضامین سے بڑھ کر کون کرا سکتا ہے۔مشہور مقولہ ہے "تصنیف را مصنف نیکو کند بیان" جیسا کہ مضامین کے مطالعہ سے ظاہر ہوگا۔

وجہ تالیف: مجھے یاد ہے کہ ان مضامین کے بیان کرنے کی وجہ یہ ہوئی کہ قرآن پاک کی آیت "**فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْبِهِمْ فَسُحْقًا لِاَصْحٰبِ السَّعِيْرِ**" (سورۂ ملک ۱۳) (غرض کفار اپنے جرم کا اقرار کریں گے سو اہل دوزخ پر لعنت ہے) کا مضمون پیش نظر ہوا کہ کفار کو آخرت میں اعتراف ذنوب یعنی گناہوں کے اقرار سے کوئی نفع نہ ہوگا بلکہ ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے طرد و لعنت سے سزا دی جائے گی۔اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم جن کے بارے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا جامع ارشاد ہے کہ "**کان خلقہ القراٰن**" اس لئے آپ کو اس سے موعظت اور تأثر ہوا کہ آخرت میں کفار کو اعتراف ذنوب سے کوئی منفعت و جزاء نہ ہوگی بلکہ ان پر لعنت و دور رہنے کی سزا دی جائے گی۔ العیاذ باللہ تعالیٰ

اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی لفظ و کلمہ سے اللہ کی جناب میں "**انا المقر المعترف بذنبی**" فرما کر اپنے اقرار و اعتراف ذنب کا اظہار فرمایا کہ ہم اسی حیات دنیا میں باوجود آپ کی طرف سے عصمت کی نعمت سے نوازے جانے کے اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں نہ کہ کفار کی طرح کہ دنیا میں تو خوب کبر و غرور میں اکڑتے رہے مگر آخرت میں جب عذاب دوزخ دیکھا تو گناہوں و خطاؤں کا اعتراف و اقرار کرنے لگے، جن سے ان کو ذرا بھی نفع نہ ہوگا۔ بلکہ اللہ کی طرف سے لعنت و دوری کے کلمات سے ذلیل کئے

جائیں گے۔ العیاذ باللہ تعالیٰ

ظاہر ہے کہ یہ کس قدر اہم موعظت آمیز مضمون ہے جس سے حضرت مصلح الامت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ (جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال باطنی کے صحیح معنوں میں وارث تھے) کو خیال پیدا ہوا، اور اس سے متأثر ہو کر یہ مضمون پورے رمضان بیان فرماتے رہے۔

حالت باطنی: اس حالت پر دلالت کرنے والے حضرتؒ کے یہ واقعات ہیں۔

۱: کبھی حضرت والاؒ یہ شعر پڑھا کرتے تھے ؎

کباب سیخ ہیں ہم کروٹیں ہر سو بدلتے ہیں — جو جل اٹھتا ہے یہ پہلو تو وہ پہلو بدلتے ہیں

ظاہر ہے کہ اس سے کس قدر خوف آخرت کا اندازہ ہوتا ہے۔

۲: نیز کبھی یہ شعر بھی پڑھا کرتے تھے ؎

چوں پیر شدی حافظ از میکدہ بیروں شو — رندی وہوسنا کی در عہد شباب اولی

اس کا واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ یہ حقیر حضرتؒ کے خاص حجرہ میں حاضر ہوا دیکھا کہ آپ تنہا ٹہل رہے ہیں اور نہایت کیف و وجد سے یہ شعر پڑھ رہے ہیں ؎

چوں پیر شدی حافظ از میکدہ بیروں شو — رندی وہوسنا کی در عہد شباب اولی

یعنی اے حافظ! جب تم بوڑھے ہو گئے تو اب میکدہ سے نکل جاؤ، اس لئے کہ رندی وہوسنا کی جوانی کے زمانہ میں تو خیر، مگر بڑھاپے میں تو یہ ذرا بھی زیب نہیں دیتی۔

۳: تیسرا واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت مصلح الامتؒ آئس کریم ایک آدھ چمچہ نوش فرمانے کے بعد اپنے نواسہ کو دیدیا اور فرمایا کہ لو تم کھاؤ اس لئے

کہ میں کھاؤں گا تو گناہ ہی کروں گا۔

سبحان اللہ! یہ باتیں کس قدر گناہوں سے خوف وخشیت بلکہ ان سے اجتناب واحتراز پر دال ہیں۔

اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ حضرتؒ کا کلام خواہ تحریری ہو یا تقریری اس میں بیحد اثر ہے جس کا ناظرین کرام اعتراف کرتے ہیں۔ چنانچہ ابھی حال میں حضرت والاؒ کے مضامین ثلاثہ (نفاق، کبر، غصہ) کا مجموعہ تسہیل وتوضیح کے ساتھ اس حقیر نے ''طہارت قلب'' کے نام سے شائع کیا ہے۔ اس کا بیحد نفع واثر کا عام لوگ اظہار کر رہے ہیں۔ چنانچہ عزیزم مولانا احمد نصر بنارسی سلمہ نے اس کی نافعیت کو خوب ہی خوب آشکارا کیا ہے اور متعدد نسخے طلب کر کے قدر دانوں کو دیا ہے۔ جیسا کہ ان کے مکتوب سے ظاہر ہے۔

مکتوبِ عزیز عزیزم مولانا احمد نصر بنارسی سلمہ

مرشد عالی مقام حضرت مخدوم مکرم استاذ معظم دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

الحمد للہ خیریت ہے۔ امید کہ مزاج گرامی مع الخیر ہوگا۔ آں مخدوم ومکرم کی ملاقات وزیارت کے بعد بآسانی واپس پہنچا۔ چونکہ سفر بنگال طے تھا اس لئے فوراً خط نہ لکھ سکا، اللہ تعالیٰ آنجناب کا سایۂ مبارکہ تادیر ہمارے سروں پر قائم رکھیں اور جناب کے فیوض وبرکات کو عام وتام فرمائے۔ آمین

آں مخدوم ومکرم نے چلتے وقت طہارت قلب نامی ایک مجلد کتاب عنایت

فرمائی تھی، کتاب کیا ہے اصلاح قلب کا انمول خزانہ ہے۔خاص کر ریا ونفاق کی بحث ایسی کہ بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔درمختار کی یہ عبارت ”**والتذکیر علی المقابر**“ نے تو احقر کو پکڑ لیا بلکہ جکڑ لیا۔اپنی اصلاح کی نیت سے اس کو بار بار پڑھا اور بنگال کے دو جلسوں میں اپنی اصلاح ہی کی نیت سے اس عبارت کو پڑھ کر سنایا اس سے ایک خاص نفع یہ ہوا کہ وعظ وتقریر کے وقت نیت کی پاکیزگی کا ایک خاص اہتمام پیدا ہوا اور ریا ونفاق جس کے متعلق احقر کا خیال ہے کہ یہ دونوں احقر کے اندر موجود ہے۔جس سے نجات بس اللہ تعالیٰ کے کرم وفضل سے اور آپ بزرگوں کی دعا وتوجہ سے ہی ممکن ہے۔

مضمون کے مطالعہ کے بعد احتساب کی فکر دامن گیر ہونے لگی، بار بار اصلاح احوال کی طرف قلب متوجہ ہونے لگا۔جزاک اللہ کہ چشم باز کردی، پوری کتاب کا مضمون عجیب وغریب روحانیت، نورانیت وجذب اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔اور کیوں نہ ہو مرشدنا مصلح الامت نور اللہ مرقدہ جیسے عالی مرتبت صاحب معرفت کا مضمون اور جناب جیسی مخلص وصادق ہستی اس کے ناقل تو پھر نشہ دوآتشہ ہونا ہی ہے۔

احقر کو اس کتاب سے بہت نفع ہوا اللہ تعالیٰ حضرت مصلح الامتؒ کے مدارج بلند فرماتا رہے اور جناب کے قلم فیض رقم کی سوزش نفس وشیطان کی سازشوں کے لئے بدرقہ ثابت ہو۔اور ہورہی ہے۔فجزاکم اللہ خیر الجزاء

بس اب قلم ساتھ نہیں دے رہا ہے۔احقر بدحال کے لئے اصلاح احوال وحسن خاتمہ ومغفرت تامہ کی دعا فرمائیں، آپ کی دعاؤں کا احقر اتنا ہی محتاج

ہے جیسے پیاسا پانی کو بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ فقط

احقر احمد نصر بنارسی غفرلہ

خادم مدرسہ وخانقاہ امدادیہ بنارس کینٹ

سنا ہے کہ حضرت مولانا محمد رابع صاحب مدظلہ نے بھی اس کتاب کو پسند فرمایا اور گزشتہ رمضان المبارک دائرہ تکیہ کلاں رائے بریلی میں سنانے کا اہتمام فرمایا۔جو میرے لئے سعادت ومسرت کی بات ہے۔اللہ ان سب کی جزا ہمارے شیخ حضرت مصلح الامتؒ کو عطا فرمائے، اور ہم سب کو ان کی تعلیمات پر عمل کرنے ہی کی نہیں بلکہ ان کو عام کرنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔آمین

حضرتؒ کی ان ہی تعلیمات کو عام کرنے کی غرض سے اس حقیر نے ماہ ربیع الاول ۱۴ھ میں ”ادارہ معارف مصلح الامت“ دار المعارف الاسلامیہ کریلی کے سامنے دار سعید میں قائم کیا ہے۔جس کی ذمہ داری عزیزم مولوی محبوب احمد قمر الزمان ندوی اور عزیزم مولوی محمد عبید اللہ قمر الزمان ندوی سلمہما کے سپرد کر رہا ہوں اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو اس ذمہ داری کو پوری کرنے کی توفیق مرحمت فرمائے، اللہ تعالیٰ اس ادارہ اور اس کی تمام اشاعتوں کو قبول فرمائے اور اس ادارہ کے تمام مقاصد حسنہ کے حصول میں آسانی فرمائے۔واللہ الموفق

ماشاء اللہ عوام وخواص کے اکثر وبیشتر منصف مزاج اشخاص حضرت مصلح الامتؒ کی ولایت وبزرگی کے قائل تھے اور اب بھی ہیں اس لئے کہ ولی کی تعریف یہ ہے ”**الولی ھو العارف باللہ تعالیٰ وصفاتہ بحسب**

مایمکن المواظب علی الطاعات المجتنب عن المعاصی المعرض عن الانہماک فی اللذات والشہوات‘‘(نبراس۴۷۶)

ولی وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کو حسب امکان جاننے والا ہو، طاعات پر پابندی کرنے والا، معاصی سے اجتناب کرنے والا ہو نیز لذات وشہوات میں منہمک ہونے سے اعراض کرنے والا ہو۔

چنانچہ الحمدللہ یہ صفات وعلامات حضرت مصلح الامتؒ کے اندر عیاں تھیں۔اس لئے یہ حقیر حضرت مصلح الامتؒ کو گناہوں سے معصوم تو نہیں لیکن محفوظ ہونے کا عقیدہ تو ضرور رکھتا ہے۔ چنانچہ بچپن کے حالات کو جاننے والوں نے بیان فرمایا کہ آپ صغائر سے بھی بچنے کا غایت درجہ اہتمام فرماتے تھے۔اور معاملات میں بھی احتیاطی پہلو کو اختیار فرماتے تھے جیسا کہ دیکھنے والوں نے دیکھا۔

اس لئے آپ بکثرت اپنے متعلقین کو گناہوں سے اجتناب اور توبہ واستغفار کی تاکید فرماتے تھے۔اور اخیر عمر میں سیدالاستغفار پڑھنے کی برابر تلقین کرتے تھے۔اسی کے ساتھ آیت کریمہ ’’لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَکَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰالِمِیْنَ‘‘ کے پڑھنے کی تعلیم فرماتے تھے اس لئے کہ قرآن وحدیث میں اس کے پڑھنے کی بہت فضیلت وارد ہے۔

اسی طرح مرشد ثانی عارف باللہ حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ بھی اس آیت کریمہ کے پڑھنے کی بہت تاکید فرماتے تھے۔

غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے توبہ واستغفار اور اعتراف ذنوب کرکے

امت کو اس سلسلہ میں اپنا ایک اسوۂ مبارک پیش فرمادیا تاکہ امت اس پر عمل پیرا ہو۔جیسا کہ حضرت مصلح الامت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ نے اپنے بیان میں اس کو بخوبی واضح فرمادیا ہے۔

اور یہ بندہ عرض پرداز ہے کہ سیدنا حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حواء علیہا السلام نے بھی اپنی اجتہادی خطا ولغزش کے بعد یہی طریق اختیار فرمایا، جس کی تلقین اللہ رب العزت نے خود فرمائی، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

فَتَلَقّٰی اٰدَمُ مِن رَّبِّهٖ كَلِمَاتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ . (سورۂ بقرہ ۳۷)

بعد ازاں حاصل کرلئے آدم علیہ السلام نے اپنے رب سے چند الفاظ تو اللہ تعالیٰ نے رحمت کے ساتھ توجہ فرمائی ان پر، بیشک وہی ہیں بڑے توبہ قبول کرنے والے بڑے مہربان۔

وہ کلمات یہ ہیں۔

رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ. (سورۂ اعراف)

اے ہمارے رب! ہم نے اپنا بڑا نقصان کیا اور اگر آپ ہماری مغفرت نہ کریں گے اور ہم پر رحم نہ کریں گے تو واقعی ہمارا بڑا نقصان ہوجاویگا۔

اسی طرح حضرت یونس علیہ السلام سے جو خطا اجتہادی ہوئی اس کی تلافی میں اللہ تعالیٰ نے ایسے ہی کلمات کی تعلیم فرمائی۔

لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَکَ — آپ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، آپ
اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ — پاک ہیں میں بیشک قصوروار ہوں۔

اسی سے ان کو مچھلی کے پیٹ سے نجات ملی، اور اللہ کو یہ تسبیح اتنی پسند ہے کہ فرمایا "وَکَذٰلِکَ نُنْجِی الْمُؤْمِنِیْنَ" یعنی قیامت تک جو کوئی بھی اپنے ظلم کا ان کلمات میں اعتراف کرے گا اس کو مصائب وبلاؤں سے نجات دیں گے۔

اسی طرح حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے اخیر میں جو دعا پڑھی جاتی ہے اس میں بھی صراحۃً **اللھم انی ظلمت نفسی ظلما کثیرا... الخ** سے اپنے قصور کا اقرار واعتراف فرمایا ہے۔ اور آپ کا نماز کے بعد تین بار استغفر اللہ پڑھنے کا معمول تھا۔

غور فرمایئے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیاء علیہم السلام نے باوجود گناہوں سے معصوم ہونے کے جب کبھی ان سے منصب نبوت کے بلند مقام کے اعتبار سے کسی غیر افضل کام پر عمل ہوگیا یا کوئی اجتہادی خطا ولغزش ہوگئی (جو قانون شرع میں گناہ نہیں) لیکن انھوں نے اس کو ذنب وگناہ تصور کرتے ہوئے روکر گڑگڑا کر اللہ تعالیٰ سے توبہ واستغفار فرمایا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کی جناب میں اس کی بیحد قدر ومنزلت ہے۔ اور یہی اللہ جل شانہ کی جناب میں قرب وقبول اور رسائی کا طریق ہے، اور یہی طریق ساری امت کے لئے اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی اور وصل وقرب

کی راہ ہے، یعنی اپنے قصور وخطا کا اعتراف ہو اور کبر وغرور سے اجتناب۔ اس لئے کہ اسی کبر وغرور کی وجہ سے ابلیس اور اس کے بعد کے تمام متکبرین مردود بارگاہ ہوئے۔ **فاعتبروا یا اولی الابصار.**

انتباہ: حضرت مصلح الامت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ کے اعتراف ذنوب کے مضامین عالیہ کو پڑھ کر دل متأثر ہوا اس لئے دل میں تقاضا ہوا کہ اس سلسلہ میں اور بہت سے واقعات جو حضرت مصلح الامتؒ سے اس حقیر نے سنے ہیں یا خود کتابوں میں پڑھے ہیں ان کو اعتراف قصور کے نام سے جمع کروں اور بطور ضمیمہ کے اس سے لاحق کروں۔ اللہ تعالیٰ اس ضمیمہ کو مثل اصل کتاب کے قبول فرمائے اور امت کے لئے مفید بنائے۔ آمین

محمد قمر الزماں الٰہ آبادی
بیت الاذکار، وصی آباد، الٰہ آباد
۱۵؍محرم الحرام ۱۴۲۹ھ

خلاصۂ کتاب

کتاب شروع کرنے سے پہلے اس کا ضرور مطالعہ فرمالیں

باسمہ تعالیٰ

الحمدلولیه والصلوٰة والسلام علیٰ نبیه وعلیٰ اٰله و صحبه المتخلقین باخلاقه.

حضرت مرشدی مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ نے اپنے مجموعۂ افادات مسمیٰ بہ ''اعتراف ذنوب'' میں اس بات کو ثابت فرمایا ہے کہ اعتراف ذنوب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اہم واعظم سنتوں میں سے ایک سنت ہے، اور اس کے ثبوت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دعا ''**انا المقر المعترف بذنبی**'' کو ارقام فرما کر اس پر بہترین کلام فرمایا ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ آپ کی یہ دعا آپ کی عبدیت وفنائیت تواضع وفروتنی پر دال ہے۔ اور یہی طریقہ آپ کی جملہ باطنی ترقیات کا سبب وزینہ ہے، اور اسی کو اپنی امت کے لئے اسوۂ حسنہ چھوڑ کر دنیا سے رحلت فرمائی ہے۔ **فجزاهم الله عنا وسائر الامة**

اس لئے امت کے خواص یعنی صحابۂ کرام، تابعین اور صالحین نے اس طریقۂ مسنونہ کو اختیار فرمایا اور اس کے ذریعہ مقامات سلوک طے فرمایا اور فائز المرام ہوئے۔

یہ طریقہ تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے متبعین کا تھا، اب ایک دوسرا طریقہ بھی ملاحظہ فرمائیں وہ ہے ابلیس لعین کا طریقہ، جو تمرد، سرکشی اور غرور وپندار پر مبنی ہے، جس پر سرکش، متکبر اور جابر وظالم لوگ چلے اور تباہ وبرباد ہوئے۔ اور

ابلیس کے ساتھ وہ بھی راندہ درگاہ اور جہنم رسید ہوئے۔ **اعاذنا الله تعالیٰ منها**

اور دونوں طریق کے سالکین کا مرجع ومنزل الگ الگ ہے، یعنی پہلے طریقہ کے لوگوں کا مرجع ومقام جنت ہے، اور دوسرے طریقہ پر چلنے والوں کا مرجع جہنم ہے۔ جیسا کہ جنت وجہنم کے باہم مباحثہ میں اس کی تصریح حدیث پاک میں آئی ہے کہ جابر اور متکبر لوگوں کی جگہ جہنم ہے، اور ضعیف اور کمزور وکمتر لوگوں کا مقام جنت ہے۔

عن ابی هريرةؓ قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم تحاجت الجنة والنار فقالت النار اوثرت بالمتكبرين والمتجبرين وقالت الجنة فمالی لايدخلنی الا الضعفاء الناس وسقطهم وغرتهم قال الله للجنة انما انت رحمتی ارحم بک من اشاء من عبادی وقال للنار انما انت عذابی اعذب بک من اشاء من عبادی ولكل واحدة

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جنت ودوزخ نے آپس میں بحث وتکرار کی، چنانچہ دوزخ نے تو یہ کہا کہ مجھے سرکش وتکبر اور ظالموں کے لئے چھانٹا گیا ہے اور جنت نے یہ کہا کہ میں اپنے بارہ میں کیا کہوں میرے اندر بھی تو وہی لوگ داخل ہوں گے جو ضعیف وکمزور ہیں۔ لوگوں کی نظروں میں گرے ہوئے ہیں اور جو بھولے بھالے اور فریب میں آجانے والے ہیں (یہ سن کر) اللہ نے جنت سے فرمایا تو میری رحمت کے اظہار کا ذریعہ اور میرے کرم کی آماجگاہ

منكما ملؤها فاما النار فلاتمتلئى حتى يضع الله رجله تقول قط قط قط فهنالك تمتلئى ويزوى بعضها الى بعض فلايظلم الله من خلقه احدا واما الجنة فان الله ينشى لها خلقا. (متفق عليه)

(مشکوٰۃ شریف
باب خلق الجنة والنار ص ۵۰۵)

کے علاوہ کچھ نہیں، میں اپنے بندوں سے جس کو اپنی رحمت سے نوازنا چاہتا ہوں اس کے لئے تجھے ہی ذریعہ بناتا ہوں، اور دوزخ سے فرمایا تو میرے عذاب کا محل ومظہر ہونے کے علاوہ کچھ نہیں، میں اپنے بندوں میں سے جس کو عذاب دینا چاہتا ہوں اس کے لئے تجھے ہی ذریعہ بناتا ہوں، اور میں تم دونوں ہی کو لوگوں سے بھر دوں گا۔ البتہ دوزخ کے ساتھ تو یہ معاملہ ہوگا کہ وہ اس وقت تک نہیں ......

...... بھرے گی جب تک کہ اس پر اللہ تعالیٰ اپنا پاؤں نہ رکھ دے گا، چنانچہ جب اللہ تعالیٰ اپنا پاؤں رکھ دے گا تو دوزخ پکار اٹھے گی کہ بس، بس، بس اس وقت دوزخ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے بھر جائے گی۔ اور اس کے حصوں کو ایک دوسرے کے قریب کر دیا جائے گا (پس وہ سمٹ جائے گی) مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق میں سے کسی پر ظلم نہیں کرے گا، رہا جنت کا معاملہ تو (اس کے بھرنے کے لئے) اللہ تعالیٰ نئے لوگ پیدا کر دے گا۔

اب ایک خاص بات جس کی طرف حضرت مصلح الامتؒ نے شدومد سے اپنے مضمون میں توجہ دلائی ہے وہ یہ ہے کہ یہ صفاتِ بد جو ابلیس لعین اور اس کے متبعین کے ہیں ان سے مسلمانوں کو بہت زیادہ پر حذر رہنا چاہئے، ورنہ یہ بھی اس کے وبال وعذاب کے شکار ہو جائیں گے۔

جیسا کہ ایک ریاکار عابد جو درحقیقت خدا پرست نہ تھا بلکہ عبادت پرست تھا، اصل عبادت کی اس کو ہوا بھی نہ لگی تھی، اس نے ایک گنہگار کے مقابلہ میں کبر وغرور اختیار کیا اور سخت باتیں اس کو کہیں تو اس کا انجام بہت برا ہوا، جس کو شیخ سعدیؒ نے بوستاں میں بالتفصیل بیان فرمایا ہے۔ اور حضرت مصلح الامتؒ نے اس کی خوب ہی خوب توضیح فرمائی ہے اور مسلمانوں کو ایسی عبادتِ ریائی سے ڈرایا ہے۔ لہٰذا اس کو بغور مطالعہ کریں اور عبرت ونصیحت حاصل کریں۔

اس کے بعد اس حقیر نے ''اعتراف قصور'' کے نام سے مفصل مضمون کا اضافہ کیا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جیسے اللہ کے معاملہ میں اپنی کوتاہیوں کا اعتراف فرمایا ویسے ہی اللہ کی مخلوق کے معاملہ میں بظاہر جو خطا وقصور ہوا تو اس کا بھی اعتراف کر کے صاحب حق سے عذر فرمایا اور طالب عفو ہوئے۔ صحابہ کرام، تابعین، تبع تابعین اور صالحین امت اس طریقۂ مسنونہ پر خوب ہی خوب چلے، اور اللہ کی رضا وخوشنودی سے مشرف ہوئے۔ اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کے لئے یہ اسوۂ حسنہ چھوڑا۔

مگر افسوس کہ اس سلسلہ میں عوام تو عوام خواص سے بھی کوتاہیاں ہو رہی ہیں۔ مثال کے طور پر یہ سمجھئے کہ پہلے حج کا جب کوئی ارادہ کرتا تھا تو اپنے متعلقین میں سے کسی سے بے ادبی یا حق تلفی کا احتمال بھی ہوتا تھا ان سے ضرور معافی مانگتا تھا اس کے بعد حج کا سفر کرتا تھا مگر اب باوجود اس کے اس کی ذرا پروا نہیں کی جاتی۔ اسی طرح تقریبات کے موقع پر عموماً تعلقات میں سدھار آجاتا تھا، اس لئے کہ اعزہ واحباب حتیٰ کہ پونیوں (کام کرنے والے

لوگوں) کو بھی راضی کرنے کی فکر کی جاتی تھی، مگر اب تو عموماً اپنے بڑوں کو بھی خوش کرنا درکنار بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ناخوش رکھنے کی ہی کوشش کی جاتی ہے۔اس لئے کہ ان پر برملا ردوقدح کی جاتی ہے تو کیسے بڑے خوش رہ سکتے ہیں۔مگر اب بھی (اگرچہ قلیل ہی سہی) مگر دنیا ایسے سعادتمندوں سے خالی نہیں ہے جو اپنے بڑوں کا اکرام اور چھوٹوں پر شفقت کا سلوک کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ پوری امت کو باہمی ضروری حقوق کی ادائیگی ورعایت کی توفیق مرحمت فرمائے تاکہ یہ دنیا جنت کا نمونہ بن جائے۔وماذالک علی اللہ بعزیز

اب پھر اصل مضمون یعنی اعتراف ذنوب' عاجزی ونیستی تضرع وزاری کی اہمیت وضرورت کو اجاگر کرتے ہوئے یہ عرض کرتا ہوں کہ انہیں صفات حسنہ سے متصف ہو کر ہی اللہ کا رشتہ درست ومضبوط اور بندوں کے باہمی رشتے صحیح وقوی ہو سکتے ہیں۔اور اسی سے اللہ کی خاص رحمت دنیا میں مبذول ہوتی ہیں۔اِنَّ رَحْمَةَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ

ظاہری تدابیر کے ساتھ دعا کا التزام کریں

لہذا اس دورِ فساد میں ظاہری تدابیر اور اسباب ضرور اختیار کریں مگر ان کے ساتھ اللہ کے سامنے عجز و بے بسی دعا والتجا، تضرع وزاری کا سلسلہ بھی جاری رکھیں۔آپ کو معلوم ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ بدر میں جنگ کی کامل تدبیر کے ساتھ نہایت تضرع وزاری کے ساتھ اللہ سے دعا میں مشغول ہی نہیں بلکہ اس میں محو ہو گئے، تو اللہ کی خاص رحمت مبذول ہوئی اور

اسلام کی اساسی فتح نصیب ہوئی۔خوب سمجھئے کہ تدبیر کی نوعیت میں فرق ہو سکتا ہے مگر دعا کی اہمیت وضرورت پر متفقہ فیصلہ ہے۔کوئی فرد یا جماعت اس کا انکار نہیں کر سکتی، ورنہ اپنے ایمان کی خیر منائے۔کسی نے کیا ہی خوب کہا ہے۔

دلا سوز کہ سوز تو کارہا بکند　　دعائے نیم شبت دفع صد بلا کند

یعنی اے دل اپنے اندر سوزش پیدا کر اس لئے کہ تمہارے سوز وگداز سے بہت کام بنے گا اور تمہاری آدھی رات کی دعا سینکڑوں بلاؤں کو دور کرکے رہے گی۔

پس اے مسلمانو! اس دعا وتضرع کے ذریعہ سے اللہ کے رشتہ کو مضبوط کرو۔جس کی سخت ضرورت ہے تاکہ نصرت ورحمت کا دروازہ کھلے اور ہم کامیاب ہوں۔چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کے نجات کے بارے میں سوال کرنے پر منجملہ تین نصیحتوں کے اپنی خطا پر رونے کی بھی نصیحت فرمائی۔وہ حدیث یہ ہے۔

عن عقبة بن عامرؓ قال لقیت رسول الله صلی الله علیه وسلم فقلت ماالنجاة فقال املک علیک لسانک ولیسعک بیتک وابک علی خطیئتک.

(مشکوٰۃ ص۳۱۴ ج۲)

حضرت عقبہ ابن عامرؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی اور عرض کیا کہ (مجھے بتائیے کہ دنیا وآخرت میں) نجات کا ذریعہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا اپنی زبان قابو میں رکھو، تمہارا گھر تمہاری کفایت کرے، اور اپنے گناہوں پر روؤ۔

پس اس حدیث سے اپنی خطاؤں پر گریہ وزاری کی کس قدر ضرورت

ونا فیعت معلوم ہوئی۔اس لئے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن پاک کی تلاوت کے وقت یا کسی دوسرے صحابی سے قرآن کی سماعت کے وقت گریہ طاری ہو جاتا تھا۔آپ کے بعد صحابہ کرام اور تابعین وصالحین بھی اللہ کے خوف وخشیت سے روتے تھے۔بعض بزرگ تو ایسے بھی ہوئے ہیں کہ ایک آیت کا بار بار تکرار فرماتے رہے یہاں تک کہ صبح ہوگئی۔خود حضرت امام ابوحنیفہؒ کا بھی واقعہ ہے کہ امام نماز نے سورہ ''اِذَا زُلْزِلَت'' کی تلاوت نماز عشاء میں کی۔امام تو نماز پڑھ پڑھا کر چلے گئے مگر حضرت امام ابوحنیفہؒ اپنی داڑھی پکڑ کر صبح تک یہ کہتے رہے کہ اے وہ ذات جو ذرہ برابر نیکی کا بدلہ نیکی سے دے گی۔اور ذرہ برابر بدی کا بدلہ بدی سے دے گی۔اس عبد نعمان کو آگ سے نجات دیجئے۔

ظاہر ہے کہ یہ حضرت امام صاحب کا باطنی حال تھا جو مثل قال کے قابل اقتداء ہے۔اس لئے اس کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔یہ واقعہ حضرت مصلح الامتؒ بڑے اثر وکیف سے سناتے تھے۔اور فرماتے تھے کہ جیسے ہم امام صاحب کے قول کے مقلد ہیں ویسے ہی ان کے حال کے بھی مقلد ہونا چاہئے۔اور خود ہم نے سنا ہے کہ نماز فجر میں امام نے ''اِنَّ بَطْشَ رَبِّکَ لَشَدِیْدٌ'' پڑھا تو حضرت مصلح الامتؒ کی اس قدر زور کی چیخ نکلی کہ جیسے چھت گر جائے گی۔اسی طرح ایک مرتبہ ''اِنَّ جَهَنَّمَ کَانَتْ مِرْصَاداً. لِلطَّاغِیْنَ مَاٰباً'' کی تلاوت فجر کی نماز میں امام صاحب نے کی تو اس وقت بھی زور کی چیخ نکل گئی۔

سبحان اللہ! یہ حال تھا ہمارے بزرگوں کا،جس سے ہم لوگ عاری ہیں۔

نہ اس کا علم ہے اور نہ اس کی طلب، پھر اصلی دین ہمارے اندر کیسے آئے جو قلب کو صالح و درست کر دے۔اللہ اس کی ہم سب کو توفیق مرحمت فرمائے۔آمین

ایک اور اہم مضمون اس حقیر نے اعتراف قصور میں یہ لکھا ہے وہ یہ کہ اگر تم سے چھوٹا یا بڑا اپنے کسی دانستہ یا نادانستہ قصور وخطا کی معافی مانگے تو ضرور معاف کر دیا کرو، بلکہ اپنے سے بڑے کو تو اس کا موقع ہی نہ دو کہ تم سے معافی مانگے اس سے پہلے ہی مطمئن کر دیا کرو کہ ہم کو آپ کی بات سے رنج وغم نہیں ہے۔یہ یقیناً تمہاری شرافت وسعادت کی بات سمجھی جائے گی۔میں سمجھتا ہوں کہ اگر اس حدیث پاک کا مضمون پیش نظر ہو تو پھر اس قسم کی خطاؤں کی نوبت ہی نہ آئے۔وہ حدیث یہ ہے ''**لیس منامن لم یرحم صغیرنا ولم یؤقر کبیرنا**'' (یعنی وہ شخص ہم میں سے نہیں جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور بڑوں کی تعظیم نہ کرے) اس حدیث میں معمولی وعید نہیں ہے پس اللہ اپنے فضل سے اس وعید کے مستحق اور مورد ہونے سے بچائے۔

اس حقیر نے اپنے مضمون اعتراف قصور میں اپنے اکابر کے ان واقعات کو بھی درج کیا ہے جن سے معلوم ہوا کہ بعض ایسی بے ادبی وگستاخی ہوتی ہے کہ اکابر جو سراپا محبت اور لطف وکرم ہوتے ہیں وہ بھی اس کو معاف نہیں فرماتے بلکہ بددعا تک فرما دیتے ہیں۔ظاہر ہے کہ یہ کس قدر بدبختی کی بات ہے۔اللہ محفوظ رکھے اور اپنی پناہ میں رکھے۔آمین

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جیسے اللہ کے غضب سے پناہ مانگی ہے ویسے ہی ان کے اولیاء کے سخط وناراضی سے بھی پناہ طلب فرمائی ہے۔چنانچہ آپ کا

ارشاد ہے’’**اللّٰھم انی اعوذبک من سخطک وسخط اولیائک**‘‘

اس سے معلوم ہوا کہ اولیاء اللہ کی ناراضی سے بھی اپنے کو بچانا ضروری ہے۔یعنی ایسی کوئی اذیت کی بات نہ کرے جس سے یہ حضرات ناراض ہوں اور ایسے ناراض ہوں کہ تاحیات معاف نہ کریں۔

چنانچہ ایک واقعہ ہے جس کو کہیں پڑھا ہے وہ یہ ہے کہ زوجین یعنی میاں بیوی کہیں سفر میں جا رہے تھے۔اسی راہ پر ایک بزرگ بھی چل رہے تھے۔ اتفاق سے ان بزرگ سے بیوی کو ٹھیس لگ گئی،جس کی وجہ سے شوہر کو اس قدر غصہ آیا کہ ان کو ایک طمانچہ مار دیا۔انھوں نے اس مار کو برداشت کیا،کچھ نہ بولے اور کریموں کی طرح گذر گئے۔اس کے بعد اچانک میاں کا پیشاب بند ہو گیا۔سخت تکلیف ودرد میں مبتلاء ہو گیا۔تو اس کو خیال ہوا کہ ممکن ہے کہ ان مسافر کو اذیت پہنچائی ہے اس کی سزا میں اللہ نے مجھے اس مصیبت میں مبتلاء کر دیا ہو اس خیال کے بعد آگے بڑھ کر ان بزرگ سے ملاقات کی اور اپنی کیفیت بتلا کر معافی مانگنے لگا تو ان بزرگ نے کیا ہی خوب حقیقت بیان فرمائی کہ تم کو نہیں بلکہ تمہاری بیوی کو مجھ سے تکلیف پہونچی تھی مگر تم نے مجھ سے انتقام لیا۔اسی طرح میں نے تم سے بدلہ نہیں لیا بلکہ اللہ نے میری طرف سے تجھے یہ سزا دی ہے۔لہذا تم اللہ سے معافی مانگو۔

عزیزو! ایسا اب بھی ہو رہا ہے،ظلم وستم کا جیسے سلسلہ جاری ہے ویسے ہی اللہ کی طرف سے عذاب ونکال کا سلسلہ بھی جاری وساری ہے۔ہم سمجھیں یا نہ سمجھیں۔آج یہ باتیں سمجھ میں آنے لگیں تو دنیا میں امن وامان قائم ہو جائے۔

چنانچہ حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ نے قیامت تک کے لئے یہ ارشاد فرما دیا ہے’’**من عادی لی ولیا فقد اٰذنتہ بالحرب**‘‘ یعنی جو میرے ولی دوست سے عداوت رکھے گا تو میں اس کے مقابلہ کے لئے اعلان جنگ کرتا ہوں۔

اس لئے تمام اولیاء بلکہ تمام مسلمان جو درحقیقت اللہ تعالیٰ کے ولی ہیں ان کے ساتھ ظلم وستم کرنے والوں کو اپنے انجام بد کو پیش نظر رکھنا چاہئے۔اور اس کا خمیازہ بھگتنے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔

اس لئے تمام مسلمانوں کو بھی جو علمی ودینی اور دعوتی واسلامی جماعتوں میں سے کسی جماعت سے تعلق رکھتے ہوں ان کو بھی کسی جماعت کے امام اور ان کے متبعین اور مقلدین کی ہرگز ہرگز اپنی زبان سے تنقیص وتحقیر وتذلیل کے کلمات نہ نکالنا چاہئے۔اس لئے کہ یہ باتیں باہم فساد ونزاع کا سبب بنتی ہیں۔

رہا اپنی حد سے بڑھ کر ائمہ دین جن کے لاکھوں نہیں کروڑوں افراد متبع ومقلد ہیں ان کی بے ادبی وگستاخی تو نہایت خطرناک ہے۔

ابھی ایک عالم باعمل سے سنا کہ حرم پاک میں بعض ایسے بے بصیرت لوگوں کی تقریروں کی کیسٹیں سنائی جا رہی ہیں جن میں علماء دیوبند کے اکابر تک کی کھلے عام تنقیص بلکہ تضلیل تک کی جا رہی ہے جب کہ ان قدسی صفات علماء کے علم وحکمت اور باطنی بصیرت کے ساتھ ان کے رشد وصلاح اور تقویٰ وطہارت پر کوئی دشمن بھی انگلی نہیں اٹھا سکتا۔افسوس کہ یہ ناپاک تقریریں حرم پاک میں سنائی جا رہی ہیں اور کم فہم لوگ علماء دیوبند سے بدظن بھی ہو رہے ہیں یقیناً یہ تفریق بین المسلمین کا سبب وذریعہ ہے۔جس سے اللہ تعالیٰ نے صراحۃً منع فرمایا ہے جیسا کہ آگے آ رہا ہے۔

خاص نصیحت:

ہاں ایک خاص نصیحت پیش نظر رہنی چاہیے کہ ان علماء ربانیین اور ائمہ مجتہدین کی اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑی عظمت ووجاہت ہے لہٰذا ان کی مخالفت سے بچنا چاہیئے اس لئے کہ عین ممکن ہے کہ اللہ دنیا ہی میں اس کے عذاب کا مزہ چکھادیں۔اور عذاب کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ کوئی بیماری لگ جائے یا اولاد یا مال ودولت کی بربادی سامنے آجائے بلکہ اس کی سزا میں عبادت ومناجات کی حلاوت بلکہ ایمان کی نعمت سے بھی محرومی ہوسکتی ہے۔ جیسا کہ بلعم باعورا جو ذاکر وشاغل سب کچھ تھا۔مگر حضرت سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی بے ادبی کی تو اللہ تعالیٰ نے ایمان سلب فرمالیا اور زبان کتوں کی طرح باہر آگئی خسران دنیا وآخرت کا شکار ہوگیا۔اعاذنا اللہ تعالیٰ

پس اے مسلمانو! خصوصاً دینی واسلامی جماعتوں سے تعلق رکھنے والو! اپنی زبانوں اور قلموں کو محتاط رکھو اور خطاؤں اور گناہوں کا انبار نہ لگاؤ، یہ بڑا دھوکہ ہے یعنی اس کے باوجود یہ سمجھتے رہو کہ ہم دین کا کام کررہے ہیں۔جیسا کہ سورۂ کہف میں ارشاد ہے ”اَلَّذِیْنَ ضَلَّ سَعْیُهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَهُمْ یَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ یُحْسِنُوْنَ صُنْعًا“ یہ وہ لوگ ہیں جن کی دنیا میں کری کرائی محنت سب گئی گذری ہوئی اور وہ اس خیال میں ہیں کہ وہ اچھا کام کررہے ہیں۔

پس اے اللہ کے بندو! اللہ کے اس ارشاد پر عمل کرنا لازم سمجھو وہ یہ ہے۔

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا “ (سورۂ ال عمران)

یعنی اور مضبوط پکڑو رسی اللہ کی سب مل کر اور پھوٹ نہ ڈالو

اس کے فائدہ کے تحت حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے نہایت بصیرت افروز مضمون ارقام فرمایا ہے اس کو بعینہٖ نقل کرتا ہوں۔

ف: یعنی سب ملکر کو قرآن کو مضبوط تھامے رہو جو اللہ کی مضبوط رسی ہے۔ یہ رسی ٹوٹ تو نہیں سکتی ہاں چھوٹ سکتی ہے۔اگر سب مل کر اس کو پوری قوت سے پکڑے رہو گے تو کوئی شیطان شرانگیزی میں کامیاب نہ ہوسکے گا اور انفرادی زندگی کی طرح مسلم قوم کی اجتماعی قوت بھی غیر متزلزل اور ناقابل اختلال ہوجائے گی۔قرآن کریم سے تمسک کرنا ہی وہ چیز ہے جس سے بکھری ہوئی قوتیں جمع ہوتی ہیں اور ایک مردہ قوم حیات تازہ حاصل کرتی ہے لیکن تمسک بالقرآن کا یہ مطلب نہیں کہ قرآن کو اپنی آراء واہواء کا تختۂ مشق بنالیا جائے، بلکہ قرآن کریم کا مطلب وہی معتبر ہوگا جو احادیث صحیحہ اور سلف صالحین کی متفقہ تصریحات کے خلاف نہ ہو۔(ترجمہ شیخ الہند تفسیر عثمانی ص۸۰)

اس سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو جیسے اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑنے کی ضرورت ہے ویسے ہی باہم افتراق سے بچنے کی بھی خاص ضرورت ہے۔اس سے تفرق وتفریق کی کتنی مذمت ثابت ہوئی کہ اللہ کی رسی کو پکڑنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ تفریق سے بچنا بھی لازم ہے تاکہ امت کی اجتماعیت قائم رہے۔اور باہم اتحاد واتفاق برقرار رہے۔لہٰذا اس کے لئے بھی ہم کو اپنے سلف کی ہدایات کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔

چنانچہ شیخ العرب والعجم حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ فرماتے ہیں کہ لوگ باہم اتحاد واتفاق کی باتیں کرتے ہیں مگر اس کا جو طریقہ ہے اس کو اختیار نہیں کرتے۔اور وہ اپنے اندر تواضع،فروتنی اور عبدیت اور خشیت کا پیدا کرنا ہے۔

اس لئے کہ جب یہ خصال پیدا ہو جائیں گی تو دوسروں کی خوبیاں اور اچھائیاں پیش نظر ہو جائیں گی۔ اور اپنے لئے نہ کوئی حال دیکھے گا اور نہ مقام بلکہ اپنے عیوب ونقائص کو پیش نظر رکھے گا۔ تو پھر اختلاف کے بجائے اس کے لئے باہم اتحاد آسان ہو جائے گا۔ اور ظاہر ہے کہ جس کو اپنے عیوب ونقائص پیش نظر ہو جائیں تو یہ بھی محض عطیہ خداوندی ہے۔ چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کے ساتھ خیر کا ارادہ فرماتے ہیں تو اس کو دین کا فقیہ اور دنیا سے زاہد اور اپنے عیوب کا بصیر بنا دیتے ہیں۔

اور یہ بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم کسی دوسرے کے عیوب کو بیان کرنے کا ارادہ کرو تو اپنے عیوب پر نظر ڈالو۔ (کشف الخفاء ص ۶۹ ج ۱)

معلوم ہوا کہ اپنے عیوب کی بصیرت بندہ کا عمدہ حال ہے جس سے اپنے اکابر بہرہ ور تھے۔ چنانچہ حضرت مصلح الامت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے ؎

اوروں پر معترض تھے لیکن جو آنکھ کھولی
اپنے ہی دل کو ہم نے گنج عیوب پایا

اور اسی مضمون کی عارف باللہ مولانا محمد احمد صاحبؒ نے یوں تعبیر فرمائی ہے ؎

کھل گئی جب سے چشم بصیرت — اپنی نظروں سے خود گر گئے ہم

اسی طرح بہادر شاہ ظفرؒ نے کیا ہی خوب اشعار کہے ہیں ؎

نہ رہی حال کی جب ہمیں اپنی خبر رہے دیکھتے اوروں کے عیب وہنر
پڑی اپنی برائیوں پہ جو نظر تو نظر میں کوئی برا نہ رہا

ظفر آدمی اس کو نہ جانئے گا وہ ہو کتنا ہی صاحب فہم وذکا
جسے عیش میں یاد خدا نہ رہی جسے طیش میں خوف خدا نہ رہا

اللہ ہم سب کو عیوب کی بصیرت کی نعمت سے مشرف فرمائے اور طریق کو آسان فرمائے۔ **وماذالک علی اللہ بعزیز**

حاصل کلام یہ ہے کہ ہم نے بزرگوں کے بہت سے واقعات وحکایات درج کئے ہیں جن کے مطالعہ سے ان کی تواضع وفروتنی، گریہ وزاری، معافی مانگنے اور معاف کرنے کے اوصاف معلوم ہوں گے۔ اور انشاء اللہ ان کے پڑھنے سے پڑھنے والوں کا سخت دل بھی نرم بلکہ موم ہو جائے گا۔ ہاں مگر خلوص سے عمل کے لئے پڑھے گا تو ضرور یہ کیفیت ورقت پیدا ہوگی۔ ورنہ تو صحیح بات یہ ہے کہ ایسے قلب اور پتھر میں کچھ فرق نہ رہ جائے گا۔ **العیاذ باللہ تعالیٰ**

اس موقع پر حضرت الشیخ ابوالمواہب عبدالوہاب ابن احمد الشعرانیؒ کی اس عبارت کا ترجمہ نقل کرنا بے موقع نہ ہوگا جو انھوں نے ''الطبقات الکبریٰ'' کے دیباچہ میں لکھا ہے۔

''ایک اور بات جتلا دینے کی یہ بھی ہے کہ جو شخص اس قسم کی کتابیں دیکھے اور اس کے دل میں اللہ عزوجل کے طریق کا میلان وشوق نہ پیدا ہو تو وہ مُردوں کے شمار میں ہے''۔ والسلام

مگر افسوس کہ ایسی کتابوں کے پڑھنے کے لئے فرصت ہی نہیں، بلکہ اپنے سے قریب سے قریب تر جماعتوں کو اس کی طرف رغبت ہی نہیں، تو پھر اللہ کی نسبت ومعرفت کیسے حاصل ہوگی، اور نفس کو کیسے پاکی نصیب ہوگی،

جوحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا اہم مقصد ہے۔ واللہ الموفق

اللہ نے قرآن پاک میں انبیاء علیہم السلام کے واقعات وقصص اسی لئے بیان فرمایا ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی خوب ہی خوب توضیح فرمائی ہے، تاکہ امت کو عبرت ونصیحت ہو اور طریق واضح ہو۔

لہذا ان واقعات کو چشم عبرت اور دیدہ دل سے پڑھیں تو انشاء اللہ ضرور اثر ونفع ہوگا، اور اکابر کی سیرتِ خوب پڑھ کر انشاء اللہ ان کی سیرتِ نیک کو اختیار کرنے کا داعیہ وجذبہ پیدا ہوگا، اور ممکن ہے کہ سیرت کا کوئی حصہ نصیب ہوجائے۔ **وماذالک علی الله بعزیز.**

اب میں اخیر میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک اہم دعا پر اس مضمون کو ختم کرتا ہوں، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی غایت خوف وخشیت اور کمال عبدیت پر دال ہے۔ وہ دعا یہ ہے:

اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِیْ عَیْنَیْنِ هَطَّالَتَیْنِ تَسْقِیَانِ الْقَلْبَ بِذُرُوْفِ الدَّمْعِ مِنْ خَشْیَتِکَ قَبْلَ اَنْ تَکُوْنَ الدُّمُوْعُ دَماً وَّالْاَضْرَاسُ جَمْراً.

یا اللہ نصیب کر مجھے آنکھیں برسنے والی کہ سیراب کریں دل کو بہتے ہوئے آنسوؤں سے تیرے خوف سے قبل اس وقت کے کہ ہوجائیں آنسو خون اور داڑھیں انگارے۔

اللہ اپنے فضل وکرم سے اس دعا کو خوب کیف وحال کے ساتھ کرنے کی توفیق مرحمت فرمائے، اور ربیع الاول کے فیوض وبرکات سے مالا مال فرمائے۔ آمین

جس کے متعلق کیا ہی خوب شعر ہے ؎

لهذا الشهر فی الاسلام فضل — منقبته تفوق علی الشهور
ربیع فی ربیع فی ربیع — نور فوق نور فوق نور

محمد قمر الزمان الہ آبادی ربیع الاول ۱۴۲۹ھ

خلاصۂ طریق

اب یہ حقیر حضرت مصلح الامت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ کے ایک تحقیقی ارشاد پر مع کسی قدر تشریح کے اس خلاصۂ کتاب کو ختم کرنے کی سعادت حاصل کررہا ہے۔ واللہ ولی التوفیق

فرمایا کہ اس طریق (بلکہ دین) کی اصل دو چیزوں پر ہے، ایک تواضع دوسرے توکل۔ اس لئے کہ تواضع سے اللہ کی مخلوق سے تعلق درست ہوجائے گا اور توکل سے اللہ تعالیٰ سے۔ اور یہی دونوں اصل ہیں دین وطریق کے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں متعدد مقام پر خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اور امت کو توکل کا صراحۃً امر فرمایا ہے، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُتَوَکِّلِیْنَ (ال عمران ۱۵۹)

پھر جب قصد کر چکا تو اس کام کا تو بھروسہ کر اللہ پر اللہ کو محبت ہے توکل والوں سے۔

دوسرے مقام پر یوں ارشاد ہے۔

وَعَلَی اللّٰهِ فَتَوَکَّلُوْا اِنْ کُنْتُمْ مُؤْمِنِیْنَ.

اور اللہ ہی پر توکل کرو اگر تم ایمان رکھتے ہو۔

پس جس طرح اللہ تعالیٰ نے توکل کا امر فرمایا ہے ویسے ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو عام مومنین کے ساتھ تواضع کرنے کا بھی امر فرمایا۔

وَاخۡفِضۡ جَنَاحَکَ لِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ (سورۂ نحل ۸۸)	اور جھکا اپنا بازو ایمان والوں کے واسطے۔

اسی طرح فرمایا۔

وَاصۡبِرۡ نَفۡسَکَ مَعَ الَّذِيۡنَ يَدۡعُوۡنَ رَبَّهُمۡ بِالۡغَدٰوةِ وَالۡعَشِيِّ يُرِيۡدُوۡنَ وَجۡهَهٗ وَلَا تَعۡدُ عَيۡنٰکَ عَنۡهُمۡ تُرِيۡدُ زِيۡنَةَ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا (سورۂ کہف)	اور روکے رکھ اپنے آپ کو ان شکستہ اور خستہ دلوں کے ساتھ جو پکارتے ہیں اپنے رب کو صبح وشام، طالب ہیں اس کی رضا کے، اور دنیوی زندگانی کی رونق خیال سے آپ کی آنکھیں ان سے ہٹنے نہ پاویں۔

پس آپ حضرات غور فرمایئے کہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کو امر ہو رہا ہے کہ حجرۂ مبارکہ سے باہر نکل کر ان خستہ حالوں اور شکستہ دلوں کے ساتھ اپنے کو روکے رہیں خواہ اس سلسلہ میں آپ کو مشقت ہی کیوں نہ برداشت کرنا پڑے، مگر ان کی دلجوئی آپ پر لازم ہے مزید ایک حدیث قدسی بھی ملاحظہ فرمائیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور پوری امت کو باہم تواضع کرنے کا امر فرمایا ہے، وہ یہ ہے۔

عن جابر بن حمادؓ قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ان الله اوحىٰ الى ان تواضعوا حتىٰ لايبغى احد ولايفخر احد على احد. (رواہ مسلم)

حضرت جابر بن حماد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے میری جانب وحی فرمائی جس میں مجھ کو اور تم سب کو حکم دیا ہے کہ تواضع اختیار کرو، یہاں تک کہ کوئی شخص کسی پر ظلم وزیادتی اور زبان درازی نہ کرے اور کوئی شخص کسی پر فخر نہ کرے۔

اہل لغت کہتے ہیں کہ بغی کے معنی ظلم وزیادتی کے ہیں۔ معلوم ہوا کہ جو شخص زبان دراز ہو وہی درحقیقت ظالم ہوتا ہے اور اس کے پاس تواضع کا کچھ بھی حصہ نہیں جس کا حدیث پاک میں حکم ہے۔ اور اہتمام کے ساتھ حکم ہے کیونکہ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی ہے، یہ فرمانا اسی خصوصیت کو مشعر ہے ورنہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کون سا فرمان بدون وحی الٰہی کے ہوتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے کہ: "وَمَا يَنۡطِقُ عَنِ الۡهَوٰى اِنۡ هُوَ اِلَّا وَحۡىٌ يُّوۡحٰى"۔

حدیث پاک کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ تواضع کی علامت زبان کی سلامتی اور حفاظت ہے اور اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک زبان دراز شخص متواضع نہیں ہوسکتا خواہ مخلوق اس کو کچھ بھی سمجھے مگر وہ متواضع نہیں ہے۔

نیز مروی ہے کہ "**اوحىٰ الله تعالىٰ الى داؤد عليه السلام اذا رأيت لى طالبا فكن له خادمًا**" (ارشاد الطالبین) یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی کہ اے داؤد! جب تم میرے کسی طالب کو دیکھو تو اس کے خادم بن جاؤ۔

نیز ایک طویل روایت حلیۃ الاولیاء میں بھی ہے جس میں یہ قول اس طرح مذکور ہے "**اذا رأيت لى طالبا فكن لى خادمًا**" (حلية الاولياء ص ۸۵ ج ۱۰)

ف: اس سے اللہ تعالیٰ کے طالب کی کس قدر قدر ومنزلت معلوم ہوئی۔ اس لئے خود بھی اپنے اندر اللہ کی طلب صادق پیدا کرنی چاہئے اور اگر کوئی طالب مل جائے تو اس کی قدر ومنزلت بلکہ اس کی خدمت کرنی چاہئے نہ کہ ان کو جھڑکنا، جیسا کہ بعض آداب طریق سے ناواقف وبے بہرہ لوگ کرتے ہیں۔ العیاذ باللہ۔ اسی طرح جن کے دلوں میں حزن وغم اور شکستگی ہے ان کی بھی قدر کرنی چاہئے اور ان کے قرب میں اللہ کا قرب سمجھنا چاہئے اور خود بھی اپنے اندر بجائے کبر ونخوت کے تواضع اور عجز وانکسار پیدا کرنا چاہئے تا کہ اللہ کی جناب میں رسائی آسان ہو جائے۔

جیسا کہ حلیۃ الاولیاء میں یہ روایت ہے **عن مالک ابن دینار قال قال موسیٰ علیہ السلام یا رب این ابغیک قال ابغنی عندالمنکسرة قلوبھم.** (حلیۃ الاولیاء ص ۴۱۳ ج ۲) یعنی موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ اے اللہ! میں آپ کو کہاں تلاش کروں؟ جواب ملا جن کے دل ٹوٹے ہوئے ہیں وہاں تلاش کرو۔

اسی لئے خواجہ محمد معصومؒ نے فرمایا کہ ہر چیز کی قیمت ٹوٹنے سے کم ہو جاتی ہے مگر دل جس قدر ٹوٹتا ہے اتنا ہی اس کی قیمت اور بڑھتی جاتی ہے۔

اسی معنی میں علامہ اقبال کا مشہور شعر ملاحظہ ہو ؎

نہ بچا بچا کے رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں

اسی معنی میں کسی اور نے کیا خوب کہا ہے ؎

دل شکستہ میں رہتا ہے بادۂ عرفاں
سنا ہے میں نے کہ یہ شیشہ چور ہی اچھا

عفو ودرگذر اور نیازمندی وانکساری کی تعلیم

چنانچہ حضرت شاہ غلام علی دہلوی مجددی حضرت مولانا خالد کردیؒ کو ایک مکتوب گرامی میں بطور نصیحت یوں تحریر فرماتے ہیں:۔

کسی سے انتقام لینا ہمارے اور آپ کے لئے مناسب نہیں ہے۔ صبر وعفو صوفیہ کی ایک ادنیٰ عادت وخصلت ہے، اللہ تعالیٰ اس آیت پر عمل کی توفیق مرحمت فرمائے "اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ" (برائی کی مدافعت عمدہ خصلت اور اچھائی سے کریں) ہر بات کا انجام خوب سوچ لیا کریں تا کہ طائفہ درویشاں بدنام نہو۔ اپنی نظر ارادۂ الٰہی پر یا تقدیر الٰہی پر یا فعل حق تعالیٰ پر رکھنا ملکہ راسخہ بن جانا چاہئے۔ والسلام

نیز قاضی شمشیر خان صاحبؒ کے یوں خط کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

بعد سلام واضح ہو کہ آپ کا خط ملا مسرت ہوئی۔ حضرت حق سبحانہ کی یاد میں اپنی عمر اور اپنے انفاس متبرکہ کو صرف کریں۔ ذکر دوام، توجہ ونیازمندی وانکسار کو لازم سمجھیں۔ مراقبہ اور تلاوت سے اپنے اوقات کو معمور رکھیں۔ دوستوں کو سلام پہونچائیں اور تاکید کریں کہ نماز وذکر، استغفار ودرود وتلاوت قرآن کی پابندی کریں۔ والسلام

نیز ایک دوسرے صاحب کو یوں نصیحت فرما رہے ہیں:۔

ان باتوں پر حتی الامکان عمل درآمد ہونا چاہئے، ہر لحظہ توجہ بدل (بحضرت

حق) اور انتظار فیض، صحبت فساق وغافلاں سے پرہیز، گفتگو میں نرمی، مناظرے ومباحثے سے اجتناب، سینہ میں کینہ وعداوت کو جگہ نہ دینا، واقعات کو تقدیر الٰہی سے جان کر کسی سے پرخاش نہ رکھنا، اخلاق حسنہ کو کسب کرنا۔ (الفرقان ربیع الاول ۱۳۹۲ھ)

ف: جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ان باطنی سنتوں اور بزرگوں کی ان باطنی سیرتوں پر عمل کریں گے تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ضرور بالضرور ہم کو باطنی ثمرات وکیفیات سے بھی نوازیں گے۔ اللہ ہم سب کو یہ سعادت نصیب فرمائے۔ آمین (مرتب)

محبت الٰہیہ تک پہنچنے کی راہ اتباع سنت ہے

چنانچہ حضرت سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ اتباع سنت کے نتیجہ وثمرہ کے متعلق یوں ارشاد فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

"اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ" فبین ان طریق المحبة اتباعه محتمل بر دو معنی است، پس بیان کرد حق سبحانہ وتعالیٰ کہ راہے کہ باں محبت مولیٰ برسند اتباع پیغمبر است صلی اللہ علیہ وسلم قولاً وفعلاً در گفتار وکردار، وہرگاہ اتباع در قول وفعل حاصل شد اتباع در حال کہ اثر ونتیجہ آنست۔ نیز خواہد بود کہ

پس حق سبحانہ وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی محبت کا راستہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے قول وفعل گفتار وکردار کی اتباع کرنے میں ہے، اور جب قول وفعل میں اتباع نصیب ہوجائے گی تو اتباع کا جو باطنی اثر ونتیجہ ہے وہ بھی حاصل ہوجائیگا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی عطیات اعمال صالحہ کے بجالانے

المواہب آثار المکاسب۔ (فتوح الغیب)

سے ہی میسر ہوتی ہیں۔

اب ہم اسی آیت "قُلْ اِنْ كُنْتُمْ" الاٰیة (جو طریق اور مقصود دونوں کے بیان کی جامع ہے) کے متعلق حضرت سیدنا عبدالقدوس گنگوہی قدس سرہ کا نہایت نورافروز مضمون لطائف قدوسی سے نقل کرتے ہیں جس کو انشاء اللہ قارئین کرام پسند کریں گے۔

ہر نور وسرور جو اتباع سنت کے ساتھ نہ ہو وہ مکر ووسوسہ ہے

عزیز من طائفہ کہ دم محبت حق سبحانہ وتعالیٰ زدند در حق ایشاں فرمان رسید "قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ" یعنی بگوائے محمد ایں قوم مدعیان محبت را اگر شما دوست می دارید خدائے را پس متابعت کنید مارا تا دوست گیرد شمارا حق تعالیٰ ازیں جا ظاہر شد کہ دوستی حق سبحانہ وتعالیٰ مر بندہ را موقوف بر متابعت رسول است صلی اللہ علیہ وسلم پس

میرے عزیزو! جو جماعت حق سبحانہ وتعالیٰ سے محبت کا جھوٹا دعویٰ کرتی ہے، ان کی شان میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان موجود ہے۔ آپ فرمادیجئے کہ اگر تم حق سبحانہ وتعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرنے لگیں گے۔ اس سے یہ ظاہر ہے کہ حق سبحانہ وتعالیٰ کی محبت ودوستی اپنے بندوں کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرنے پر موقوف ہے۔ بس آج ہدایت کی نشانی اور نیک بختی کی

امروز نشان ہدایت وعلامت
سعادت متابعت شریعت
است کہ ظاہر عنوان باطن
است خوش گفت سعدی ایں در
صفت مثنویات ؎
محال است سعدی کہ راہ صفا
تواں رفت جز بر پئے مصطفیٰ ؎
ہر کہ در راہ محمد رہ نیافتتا ابد
گردے ازیں درگہ نیافت
ہر نورے وسرورے کہ در پناہ
شریعت نباشد آنرا مکر و وسوسۂ
شیطان دانند بغیر پناہ شریعت
اکثر اہل سلوک راراہ زدہ شدہ
است واکثر اہل توحید بغیر
استحکام شریعت درگمراہی وبے
راہی افتادہ اند۔ بیت
ہر چہ در داعیۂ شرع نیست
وسوسۂ دیو بود بے نزاع
عزیز من اگر چہ یکے را علم و

علامت شریعت کی اتباع میں ہے۔
اس لئے کہ ظاہر باطن کا عنوان ہوا
کرتا ہے۔ یعنی ظاہر سے باطن کا
اندازہ وسراغ لگتا ہے، اس سلسلہ
میں شیخ سعدیؒ نے کیا خوب کہا ہے۔
اے سعدی! حضور صلی اللہ علیہ وسلم
کے نقش قدم کو چھوڑ کر راہ صفا یعنی
سیدھے راستہ پر چلنا محال ہے۔
یعنی جس شخص کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے
راستہ پر چلنا نصیب نہ ہوا تو جناب
الٰہی سے اس کو حقیقی نعمت تو کیا گرد بھی
میسر نہ ہوگا۔ ہر نور وسرور جو شریعت کی
حمایت وحفاظت میں نہ ہو اس کو مکر
وفریب اور وسوسۂ شیطان جاننا
چاہئے۔ اور بغیر پناہ شریعت اکثر اہل
سلوک راستہ سے ہٹ گئے ہیں اور
اکثر اہل توحید شریعت پر استقامت
کے بغیر گمراہی اور بے راہ روی میں
پڑجاتے ہیں۔ یعنی جو چیز شریعت کے

وحدت برکمال باشد ووے
صاحب نسبت وخارق عادت
نیز بودہ شد بغیر استحکام احکام
شریعت از خوف مکر خالی نباشد
"لان المکر ھو ارداف
النعم مع المخالفة وابقاء
الحال مع سوء الادب"
یعنی مخالفت شریعت وسوء ادب
خارق عادت وظہور کرامت
ہمہ مکر باشد۔
(لطائف قدوسی)

داعیہ وتقاضے کے تحت نہ ہو تو وہ بلا خلاف
شیطان ملعون کا وسوسہ ہے۔ میرے
عزیزو! اگر کسی کو معرفت اور وحدانیت
کے علم پر کمال حاصل ہو اور وہ صاحب
نسبت اور صاحب خرق عادات کرامات
بھی ہو مگر وہ بھی شریعت کے احکام کے
استحکام کے بغیر مکر کے خوف سے خالی نہ
ہوگا۔ اس لئے کہ باوجود شریعت کی
مخالفت کے اللہ کی نعمتوں کا کسی پر
مسلسل آتے رہنا اور بے ادبی کے
باوجود حال باطنی کو باقی رہنا بھی مکر ہے۔

حضرت مولانا قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتیؒ ارشاد الطالبین میں اس کے متعلق نہایت بصیرت افروز مضمون ارشاد فرمایا ہے جس کا حاصل یہ ہے۔

بغیر ظاہری وباطنی سنتوں کی اتباع کے ولایت کا درجہ میسر نہیں ہوسکتا

کہا گیا ہے کہ کشف وخرق عادات اور عالم کون وفساد میں تصرف ریاضت سے بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے حکماء اشراقیین اور ہندوستان کے جوگی اس سے متمتع ہو جاتے تھے مگر یہ کمالات اہل اللہ کی نظر اعتبار سے ساقط ہیں۔ اس کو اخروٹ اور منقّا سے بھی خریدنا گوارا نہیں کرتے۔ رذائل نفس کا دفع اور

شیطان کے وسوسے کا ازالہ بغیر اتباع سنت کے ممکن نہیں ہے۔

آگے تحریر فرماتے ہیں۔

خرق عادات کا ظہور جو اتباع سنت وشریعت اور استقامت کے ساتھ ہو وہ ولایت پر دلیل بن سکتا ہے، لیکن سب سے قوی دلیل وہ ہے جو حدیث سے ثابت ہے کہ اس کی صحبت میں اور اس کے دیکھنے سے خدا یاد آئے اور دل ماسوا اللہ سے سرد ہوجائے۔ (ماخوذ از ارشاد الطالبین فارسی ص۲۴)

ف: حضرت مصلح الامت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ نے ارشاد فرمایا کہ مجھے یہاں یہ خیال ہوا کہ دوسرے غلط قسم کے لوگ بھی تو ریاکاری سے اتباع سنت کرسکتے ہیں تو پھر کرامات وغیر کرامات اور ولایت وغیر ولایت میں کیسے تمیز ہوگی، تو معًا دل میں یہ بات آئی کہ ایسے لوگوں کو منجانب اللہ اتباع سنت کی توفیق ہی نہ دی جائے گی۔ (مرتب)

تمام حسن وکمال اتباع سنت میں مضمر ہے

شیخ علی ابن ابوبکر قدس سرہ نے معارج البدایہ میں فرمایا ہے کہ ہر انسان کا حسن وکمال تمام امور میں ظاہرًا وباطنًا، اصولاً وفروعًا، عقلاً وفعلاً، عادۃً وعبادۃً کامل اتباع رسول میں مضمر ہے۔ (اقوال سلفؒ ج۳ ص۱۵۵)

راہ قبول منحصر ہے اتباع سنت پر

اسی طرح صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ فرماتے ہیں کہ راہ قبول منحصر اتباع سنت پر ہے ظاہر میں باطن میں

عقیدہ میں عمل میں، بدعات اور رسوم سے اعراض کرنا اس زمانہ میں اتباع سنت کی اصل ہے۔ (مکتوبات یعقوبی ص۱۱)

اس کے بعد حضرت مصلح الامت مولانا وصی اللہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ اس باب میں ہم کو اتنا مختصر اور اتنا حاوی مضمون کہیں نہیں ملا۔ (وصیۃ الاخلاق ص۴۸)

اصل طریق

غور فرمائیے کہ اکابر کی یہ عبارات اتباع سنت کی ضرورت واہمیت پر مثل آفتاب کے روشن ہیں اس لئے درحقیقت اصل طریق راہ سنت پر چلنا ہی ہے جس کو اختیار کرکے ہی دین ودنیا اور آخرت کی سعادت اور فوز وفلاح حاصل کرسکتے ہیں۔ بخلاف دوسرے طریق کے کہ اس میں خطرہ ہی خطرہ ہے۔ **العیاذ باللہ تعالیٰ**

اس لئے خود اپنے لئے اور اپنے متعلقین ومنتسبین بلکہ تمام مسلمین کے لئے لازم سمجھتا ہوں کہ ان ظاہری وباطنی سنتوں پر عمل کی سعی کریں تاکہ اللہ کے قرب وقبول سے نوازے جائیں۔ **وما ذالک علی اللہ بعزیز**

ربنا اتمم لنا نورنا واغفر لنا انک علی کل شئی قدیر سبحان ربک رب العزۃ عما یصفون وسلام علی المرسلین والحمدللہ رب العالمین۔

محمد قمر الزماں الٰہ آبادی عفی عنہ

بیت الاذکار، وصی آباد، الٰہ آباد

۱۱/جمادی الاخریٰ ۱۴۲۹ھ

۱۶/جون ۲۰۰۸ء

تمہید

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

یہ رسالہ جو ہدیہ ناظرین ہے مصلح الامت محی السنّت حضرت مولانا وصی اللہ صاحب قدس سرہٗ کے ان ملفوظات گرانمایہ کا مجموعہ ہے جن کو رمضان المبارک ۱۳۸۳ھ کی مجالس عالیہ میں ارشاد فرمایا تھا۔ حضرت مولاناؒ نے نظر ثانی فرما کر اس کا نام ''**الاعتراف والاستغفار من الذنوب من اعظم سنن النبی صلی اللہ علیہ وسلم**'' تجویز فرمایا۔

سبحان اللہ! کیا عمدہ نام ہے کہ نام ہی گویا پورے مضمون کا خلاصہ وماحصل ہے، اور اسی سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ کتنا اہم اور قابل توجہ مضمون ہے۔ یہ مضمون ۱۳۸۳ھ کے رسالہ ''معرفت حق'' میں قسط وار شائع ہو چکا ہے۔ جس کو عام طور پر پسند کیا گیا۔ اور یقیناً یہ مضمون سب کے لئے نہایت مفید وضروری ہے۔ خصوصا اہل سلوک وعابدین کے لئے تو اس مضمون کو پیش نظر رکھنا اور لائحہ عمل بنانا ازبس ضروری ہے۔

حضرت مولاناؒ کی ذات با برکات محتاج تعارف نہیں اور نہ ان کے مضامین عالیہ کی افادیت کے متعلق بہت کچھ لکھنے کی ضرورت ہے۔ جب آپ توجہ سے مطالعہ فرمائیں گے تو آپ کا دل اس کی افادیت وتاثیر کو خود ہی محسوس کرلے گا۔ مختصراً اس مضمون کے متعلق عرض ہے کہ حضرت والاؒ نے

سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک خاص سیرت وسنت کو پیش فرمایا ہے۔ اور آپ کی عبدیت اور افتقار الی اللہ کو آپ کی ایک دعا سے واضح فرمایا ہے۔ وہ دعا یہ ہے۔

وَاَنَا اَلبائس الفقیر	اور میں ہوں مصیبت زدہ، محتاج،
المستغیث المستجیر	فریادی، پناہ جو، ترساں وہراساں،
الوجل المشفق المقر	اقرار کرنے والا، ماننے والا، اپنے
المعترف بذنبی. اسألک	گناہ کا سوال کرتا ہوں تجھ سے سوال
مسألة المسکین وابتهل	بیکس کا سا، اور گڑگڑاتا ہوں تیرے
الیک ابتهال المذنب	سامنے گڑگڑانا گنہگار ذلیل کا سا، اور
الذلیل وادعوک دعاء	طلب کرتا ہوں تجھ سے طلب کرنا
الخائف الضریر ودعاءَ	خوف زدہ آفت رسیدہ کا سا، اور
من خضعت لک رقَبته	طلب کرنا اس شخص کا سا کہ جھکی ہوئی
وفاضت لک عبُرته	ہو تیرے سامنے گردن اسکی اور بہہ
وذل لک جسمه ورغم	رہے ہوں آنسو اسکے اور فروتنی کئے
لک انفه.	ہوئے ہو تیرے سامنے اور رگڑتا ہو
(فیض القدیر ج۲ ص۱۱۷)	تیرے سامنے ناک اپنی۔

یہ دعا مناجات مقبول منزل سوم میں درج ہے۔ جس کو ہم لوگ بطور وظیفہ پڑھتے بھی ہیں مگر حضرت والاؒ کے اس مضمون کے پڑھنے سے اس دعا کی ایک خاص اہمیت وعظمت قلب میں پیدا ہوتی ہے۔ نیز بہت سے ایسے احکام

ومسائل سلوک معلوم ہوتے ہیں جن سے حضرت والاؒ کے علم وشان اور تحقیق کا اندازہ لگتا ہے۔ اور دل تصدیق کرتا ہے کہ واقعی یہی حضرات، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات بلکہ اشارات کو صحیح معنوں میں سمجھتے ہیں۔ اور چونکہ یہ حضرات صاحب دل ہوتے ہیں اس لئے جو کچھ فرماتے ہیں اس کا قلب پر اثر ہوتا ہے۔ اور لوگ اس سے منتفع ہوتے ہیں۔ **ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء**. مثال کے طور پر اس مضمون کی چند عبارات ہم پیش کرتے ہیں تاکہ ناظرین کو بصیرت ہو اور اس سے پورے مضمون کا اندازہ ہو جائے۔ وھو ہذا

میں کہتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دعا سے معلوم ہوتا ہے کہ معصوم ہونے کے بعد بھی آپ سے اس قسم کے الفاظ جو صادر ہوئے تو یہ غایت تواضع اور کسر وانکسار کی بناء پر صادر ہوئے۔ یا یہ بات تھی کہ یہ حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام یہ سمجھتے تھے کہ طریق یہی ہے اسی سے طریق میں داخل ہوا جاتا ہے ؎

بدرگاہ لطف وبزرگیش بر　　　بزرگاں نہادہ بزرگی زسر

یعنی ان کی مہربانی اور بزرگی کے دربار میں بزرگوں نے بزرگی رکھ دیا۔

بندہ اپنے مولا کے ساتھ جس قدر عجز وانکسار اور تواضع کرے کم ہی ہے۔ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو چونکہ حق تعالیٰ کی کامل معرفت ہوتی ہے اس لئے ان کے سامنے یہ حضرات اپنے کو قصوروار اور گنہگار ہی سمجھتے ہیں۔

اب آپ سے کہتا ہوں کہ جب نبوت کا یہ طریق ہے تو ولایت تو بہرحال نبوت ہی کی فرع ہے اور اس کے تابع ہے۔ کوئی مستقل چیز نہیں ہے اس لئے

ولی کی مجال نہیں کہ اس راستہ کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ اختیار کرے۔ ؎

خلاف پیمبر کسے رہ گزید　　　کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

اس کے بعد حضرت مصلح الامتؒ نے بزرگوں کے بہت سے واقعات اور ان کی دعائیں نقل فرمائیں اور اس سلسلہ میں ان کی سیرت واتباع سنت کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ دیکھا آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "**انا البائس الفقیر الخ**" ارشاد فرما کر امت کو جو تعلیم فرمائی تھی اس کو امت نے کیسا سیکھا اور کیونکر عمل کیا۔ باقی یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اعتراف ذنب (گناہ کا اقرار) کا سبب کیا ہوا جبکہ آپ گنہگار نہیں بلکہ معصوم تھے۔ تو اس کے متعلق سنئے!

قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے " **وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلاً صَالِحاً وَّاٰخَرَ سَيِّئاً**"، اس میں اعتراف ذنب کرنے والوں کی فضیلت اور ان کی مدح فرمائی گئی ہے تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن کی شان ہی تھی " **کان خلقه القراٰنَ**"، کس طرح اس فضیلت کے حاصل کرنے سے صرف نظر فرماتے، اور یہ ظاہر ہے کہ ہر فضل وکمال انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام میں بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔ اس لئے آپ نے بھی خود کو گنہگاروں کی صف میں کھڑا کر کے ایسا اعتراف ذنب کیا اور اس طرح گریہ وزاری فرمائی کہ اس مقام کا حق ہی ادا فرمادیا، اور توبہ واستغفار میں سب سے بڑھ گئے۔

دیکھئے (اپنے متعلق) کیسے کیسے کلمات فرمائے کہ دوسرا کوئی اس طرح

کہنے پر قادر ہی نہیں ہوسکتا۔ یہ فرمایا: میں مصیبت زدہ ہوں محتاج ہوں، فریادی ہوں، پناہ جو ہوں، ترساں و ہراساں ہوں، اپنے گناہ کا اقرار کرنے والا اوراعتراف کرنے والا ہوں الخ۔

سبحان اللہ! اعتراف ذنب کا کیسا نقشہ کھینچا ہے اور اس کے ذریعہ گنہگاروں کی کس قدر دلجوئی اور تسکین فرمائی ہے، اورکس قدر عنایت ہے گنہگاروں کے حال پر کہ ان کی یوں تسلی فرمادی کہ میں ان کا بھی نبی ہوں۔ اگر میں ہی چھوڑ دوں گا تو پھر وہ کہاں جائیں گے۔ واقعی کوئی شیخ ایسا نہیں ہے جو اس طرح مرید کے مقام میں نزول کر کے ان کی تربیت کرے جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نزول فرمایا۔ انتہیٰ

اب آپ ان عبارات سے اندازہ کیجئے کہ پورا مضمون کیسا نافع واثر انداز ہوگا۔ اسلئے جی چاہا کہ ان مضامین کو جو مختلف رسالوں میں متفرق طور پر ہیں ان کو یکجا کر کے کتابی شکل دیدی جائے تاکہ انتفاع میں سہولت ہو۔

اس احقر کے لئے دعا فرماویں اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں اوراس سے ہم سب کو نفع بخشیں۔

والسلام

یکے از خدام حضرت مصلح الامتؒ

(حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب جامیؒ)

خانقاہ وصی اللہی الہ آباد

۱۳۸۳ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

حضرت مصلح الامت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ فرمارہے ہیں کہ:

مشکوٰۃ شریف سے دو حدیثیں نقل کرتا ہوں۔ یہ دونوں حدیثیں ماخذ ہیں صوفیہ کے کلام کی کہ وہ بعض اوقات مذنب کو عابد پر ترجیح دیتے ہیں۔

چنانچہ فرماتے ہیں کہ **العاصی خیر من المدعی** (گنہگار پارسائی کا دعویٰ کرنے والے سے بہتر ہے) آگے فائدہ میں اس پر مبسوط کلام کرونگا۔

پہلے حدیث شریف سنئے:

عن جندب انّ رسول الله صلى الله عليه وسلم حدث ان رجلا قال والله لايغفر الله لفلان وان الله تعالىٰ قال من ذاالذى يتالى على الله انى لااغفر لفلان فانى قد غفرت لفلان واحبطت عملك. او كما قال (رواه مسلم)

حضرت جندبؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث بیان فرمائی ہے کہ ایک آدمی نے کہا قسم اللہ کی اللہ فلاں کی مغفرت نہ کریگا۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ کون ہے جو مجھ پر قسم کھاتا ہے کہ میں فلاں کی مغفرت نہ کرونگا۔ سنو کہ میں فلاں کی مغفرت کرتا ہوں اور تیرے اعمال حبط کرتا ہوں۔ (مشکوٰۃ شریف)

یہ حدیث پھر بھی مجمل ہے۔ دوسری حدیث جو ذیل میں درج ہے وہ مفصل ہے۔

عن ابی هریرةؓ قال قال رسول
الله صلی الله علیه وسلم ان
رجلین کانا فی بنی
اسرائیل متحابَّیْنِ احد
هما یجتهد فی العبادة
والاخر یقول مذنب
فجعل یقول اقصر عما
انت فیه فیقول خلنی
وربی حتیٰ وجده یوما
علیٰ ذنب استعظمه فقال
اقصر فقال خلّنی وربی
ابعثت علی رقیبا فقال
والله لا یغفر الله لک
اذاو لایدخلک الجنة
فبعث الله الیه ملکا
فقبض ارواحهما فاجتمعا
عنده فقال للمذنب
ادخل الجنه برحمنی
وقال للاٰخر اتستطیع ان

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ
بنی اسرائیل میں دو شخص تھے جو آپس
میں محبت رکھتے تھے۔ایک عبادت میں
اجتہاد یعنی کوشش کرتا تھا اور دوسرا یہ کہتا
تھا کہ میں گنہگار ہوں۔یہ کوشش کرنے
والا گنہگار سے کہتا تھا کہ تم جس میں ہو
اس کو کم کرو وہ کہتا تھا کہ مجھکو اور میرے
رب کو چھوڑ دو۔(میں جانوں وہ جانے
یہ بطور محبت ورجاء و نیاز کے کہتا تھا)
یہاں تک کہ اس کو ایک گناہ پر پایا
جس کو بڑا سمجھا۔پس کہا اس کو چھوڑ
دو۔اس نے کہا مجھکو اور میرے رب کو
چھوڑ دو(میں جانوں وہ جانے) کیا تو
میرے اوپر نگہبان مقرر ہوا ہے۔اس
نے کہا اللہ تعالیٰ تجھکو کبھی نہ بخشے
گا اور جنت میں داخل نہیں کریگا۔
اسکے بعد اللہ تعالیٰ نے فرشتہ بھیجا۔ان
کی ارواح کو اس نے قبض کیا پس اللہ

نحظُر علی عبدی
رحمتی فقال لا یاربی
فقال اذهبوا به الی النار .
(رواه احمد)

کے پاس یہ دونوں مجتمع ہوئے۔اللہ تعالیٰ
نے گنہگار سے فرمایا میری رحمت سے
جنت میں داخل ہو جا۔اور دوسرے سے
کہا کہ کیا تم کو قدرت ہے کہ میری رحمت
کو میرے بندے پر روک لو اس نے کہا
نہیں حکم فرمایا کہ اس کو جہنم میں لے جاؤ۔

اصلاح اخلاق کی ضرورت

صوفیائے کرام اچھے اخلاق پر بہت زور دیتے ہیں اور برے اخلاق سے منع فرماتے ہیں،اور برے اخلاق میں کبر وعجب اصل ہے جو عبادت سے بھی پیدا ہوتا ہے۔اور اسکے لئے لازم ہے دوسروں کی تحقیر کرے۔اور یہ ایسا رذیلہ ہے کہ اس کے اتصاف کے ساتھ کوئی شخص قدر ومنزلت اللہ تعالیٰ کے دربار میں نہیں پا سکتا،اس لئے عبادت سے زیادہ قابل توجہ اس رذیلہ کا ازالہ ہے۔صوفیہ کے کلام میں اس کی مذمت بکثرت موجود ہے ان میں ایک یہ ہے ؎

زاہد غرور داشت سلامت نہ برد راہ رند از رہ نیاز بدار السلام رفت

ترجمہ: زاہد اپنے اندر غرور اور پندار رکھنے کیوجہ سے راستہ صحیح وسالم طے نہ کر سکا۔اور رند یعنی آزاد شخص عجز ونیاز کی راہ سے دارالسلام میں داخل ہو گیا۔نیز یہ ہے کہ ؎

ازیں نوع طاعت نیاید بہ کار برو عذر تقصیر طاعت بیار

ترجمہ: اس قسم کی عبادت (کبروعجب والی عبادت) کچھ کام نہ آوے گی۔ جاؤ اور طاعت کے قصورو کوتاہی کا عذر پیش کرو۔

میں حضرات صوفیہ کے ان ارشادات کا ماخذ بیان کرتا ہوں، وہ ماخذ یہی احادیث ہیں جو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں۔ان میں ان کا نتیجہ وانجام بیان ہوا ہے کہ عجب والے عابد کو دوزخ کا حکم ہو گیا اور مذنب (گنہگار) کو جنت کا۔صوفیہ جو سچے متبع سنت ہیں وہ سالکین راہ کو اس مزلۃ اقدام (پھسلنے کی جگہ) سے بچاتے ہیں، ان کا ہم پر کیا ہی بڑا احسان وکرم ہے اور کیسے اس مبارک راہ کے سالک ہیں۔

فجزا هم الله تعالیٰ احسن الجزاء

اور یہ سمجھ لیجئے کہ کوئی قدم بغیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کے اللہ تعالیٰ کی درگاہ میں معتبر اور مقبول نہیں ہوسکتا۔

چنانچہ حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں کہ **"الطرق کلها مسدودة الا من اقتفیٰ اثر رسول الله صلی الله علیه وسلم"** (راستے سب کے سب بند ہیں مگر اس شخص کا راستہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم پر چل رہا ہے) یہی مطلب ہے اس کا جو شیخ سعدیؒ نے فرمایا ہے۔

مپندار سعدی کہ راہ صفا ——— تواں رفت جز بر پئے مصطفیٰ
خلاف پیمبر کسے رہ گزید ——— کہ ہر گز بمنزل نخواہد رسید

ترجمہ: اے سعدی تم ہرگز یہ مت گمان کرو کہ راہ صفا کو بغیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کے طے کر سکتے ہو۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جس

نے راستہ اختیار کیا وہ منزل مقصود تک نہیں پہونچے گا۔

اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسوۂ حسنہ قائم فرمادیا تا کہ مشائخ عظام مذنبین کو اسی راہ سے لے چلیں وہ یہ ہے کہ آپ نے ذنب کا اعتراف قولاً وعملاً وحالاً فرمایا تا کہ اعتراف ذنب کی تحسین بخوبی ذہن نشین ہوجائے، چنانچہ آپ نے اس طرح دعا فرمائی ہے کہ:۔

وَاَنَا اَلبائس الفقیر	اور میں ہوں مصیبت زدہ، محتاج،
المستغیث المستجیر	فریادی، پناہ جو، ترساں وہراساں،
الوجل المشفق المقر	اقرار کرنے والا، ماننے والا اپنے گناہ کا
المعترف بذنبی. اسألک	سوال کرتا ہوں تجھ سے سوال بیکس کا سا،
مسألة المسکین و ابتهل	اور گڑگڑاتا ہوں تیرے سامنے گڑگڑانا
الیک ابتهال المذنب	گنہگار ذلیل کا سا، اور طلب کرتا ہوں
الذلیل وادعوک دعاء	تجھ سے طلب کرنا خوف زدہ آفت
الخائف الضریر ودعاء	رسیدہ کا سا، اور طلب کرنا اس شخص کا سا
من خضعت لک رقبته	کہ جھکی ہوئی ہو تیرے سامنے گردن
وفاضت لک عبرته	اسکی اور بہہ رہے ہوں آنسو اسکے اور
وذل لک جسمه ورغم	فروتنی کئے ہوئے ہو تیرے سامنے اور
لک انفه (فیض القدیر ج۲ ص۱۱۷)	رگڑتا ہو تیرے سامنے ناک اپنی۔

دیکھئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم باوجود یکہ سید الانبیاء ہیں مگر کس قدر تواضع کے کلمات فرما رہے ہیں۔حق تعالیٰ کے سامنے اپنے کو فقیر، وجل، معترف

بذنب، مسکین، مذنب ذلیل سبھی کچھ فرما رہے ہیں تو آپ کی غایت تواضع تھی اور امت کو تعلیم دینا مقصود تھا کہ وہ لوگ یہ دیکھیں کہ جب ایسی ذات جو کہ معصوم ہے اللہ تعالیٰ کے سامنے اس طرح تضرع وزاری کے ساتھ دعا کر رہی ہے تو جو لوگ کہ معصیت سے پُر ہیں اور شب وروز گناہ میں منہمک رہتے ہیں انہیں اللہ تعالیٰ کے سامنے کس قدر گڑ گڑانا چاہئے۔ تمام انبیاء علیہم السلام کی یہی سنت رہی ہے، اور ہر زمانہ میں صالحین کا یہی شعار رہا ہے۔

چنانچہ بزرگان دین کے واقعات ہم آگے بیان کرینگے۔ یہاں یہ سمجھئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قدر تواضع اور انکساری کے ساتھ جو یہ کلمات فرمائے اس کو صوفیاء کی اصطلاح میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ ان حضرات کے یہاں ایک تو ہوتا ہے عروج اور ایک ہے نزول۔

نزول، عروج سے بڑھا ہوا ہے

چنانچہ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ نزول، عروج سے بڑھا ہوا ہے۔ اس لئے کہ اس میں عبدیت کی شان ظاہر ہوتی ہے۔ اور عبدیت سب مقام سے اعلیٰ وارفع ہے۔ اس پر حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کا ایک واقعہ یاد آیا کسی نے حضرتؒ سے دریافت کیا کہ حضرت مشہور ہے کہ سیدنا عبد القادر جیلانیؒ نے ایک مرتبہ بغداد کی جامع مسجد میں منبر پر بیٹھ کر یہ فرمایا کہ میرا یہ قدم تمام اولیاء اللہ کی گردن پر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آواز کو سب اولیاء اللہ کے کانوں تک پہونچادیا۔ چنانچہ سب نے اس کے جواب میں یہ کہا کہ **بلیٰ علی**

الراس والعین بلکہ ہمارے سر اور آنکھوں پر ہے۔ تو اس سے تو سلسلۂ قادریہ کی فضیلت دوسرے سلاسل پر معلوم ہوتی ہے۔ حضرت حاجی صاحب قدس سرہ نے فرمایا کہ نہیں، اس سے فضیلت کیسے ثابت ہوگئی، زیادہ سے زیادہ یہ کہ اس کلمہ سے حضرت سیدنا عبد القادر جیلانیؒ کا عروج میں ہونا معلوم ہوتا ہے۔ اور جملہ اولیاء اللہ کا نزول میں اور نزول، عروج سے بڑھا ہوا ہے۔ یہ مسئلہ سب صوفیہ کے نزدیک مسلم ہے۔

شیخ کا طالبین کی اصلاح کے لئے اپنے مقام سے نزول

اسی طرح ان حضرات کے یہاں یہ بھی دستور ہے کہ شیخ جب طالبین کی اصلاح کرنا چاہتا ہے تو اپنے مقام سے نزول کرتا ہے۔ اور ان کی استعداد کے مطابق کلام کرتا ہے ورنہ اگر وہ اپنے ہی مقام پر رہے اور اپنے حال کے مطابق کلام کرے تو طالبین کو نفع نہ ہوگا اس لئے کہ طالب شیخ کے احوال کا تحمل ہی نہیں کرسکتا۔ بس اسی طرح یہاں سمجھئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب امت کی اصلاح پیش نظر ہوئی تو آپ نے اپنے اعلیٰ وارفع مقام سے نزول فرمایا اور ان کی صلاحیت اور ان کے احوال کو ملحوظ فرما کر اسی کے اعتبار سے ان کی اصلاح وتعلیم فرمائی۔ اس طرح یہ دعا ساری امت کے لئے سنت ہوگئی۔ پس امت باوجود مختلف درجات ومراتب پر ہونے کے اس کو حرز جان بنانے کی مکلّف ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ تواضع تمام خصال واخلاق کی اصل ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اخلاق ہی کے سکھانے کیلئے مبعوث ہوئے تھے تو

اب اگر آپ صرف زبان سے یہ فرمادیتے کہ لوگو! تواضع اختیار کرو تو کسی کے سمجھ ہی میں نہ آتا کہ تواضع کیا چیز ہے، اور کیسے اختیار کی جاتی ہے۔ اس لئے آپ نے یہ کیا کہ اپنے آپ کو عاصیین اور مذنبین کی صف میں رکھ کر اللہ تعالیٰ سے انابت اور استغفار کیا، اور اس کے لئے جن جن کلمات کا اختیار کرنا ایک مذنب (گنہگار) کے شایان شان ہوسکتا تھا آپ نے ان سب کو استعمال فرمایا اور زبان سے کہنے کے ساتھ ساتھ اپنے حال اور انداز سے سراپا تواضع ومسکنت کے مظہر بن گئے۔ اس لئے کہ آپ معلم تھے اگر آپ اس طرح حال سے تعلیم نہ فرماتے تو امت کو اس کا علم ہی نہ ہوتا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا امت پر احسان

یہاں ایک بات اور سمجھ لیجئے وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول وفعل اور حال سے اعتراف ذنب کا جو اسوہ (نمونہ) مذنبین کیلئے قائم فرمایا تو اس کے ذریعہ آپ نے ہمارے حال پر احسان عظیم فرمایا اس لئے کہ یہ خیال ہوسکتا تھا کہ مذنب بوجہ مجرم ہونے کے حق تعالیٰ کے آگے لب کشائی کی ہمت نہ کرسکتا اور اعتراف ذنب کے وقت اس کی زبان لڑکھڑا جاتی۔ جیسا کہ کہا گیا ہے ؎

اُحِبُّ مناجاةَ الحبیبِ باوجهٍ　　ولکن لسانَ المذنبینَ کلیلٌ

ترجمہ: میں چاہتا ہوں کہ محبوب حقیقی (حق تعالیٰ) سے طرح طرح سے مناجات کیا کروں مگر گنہگاروں کی زبان تو لنجی ہوتی ہے، اس لئے کیسے کروں۔

لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلیم فرمانے کے بعد اب یہ کہنا صحیح نہیں کہ مذنبین کی زبان کلیل (لنجی) ہے، اس لئے کہ آدمی کبھی اپنی بات اپنی زبان سے کہتا ہے اور کبھی دوسرے کی طرف سے اس کی بات اپنی زبان پر جاری کرتا ہے تو یہاں ایسا ہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان کلمات کو مذنبین کا سا حال طاری کر کے ان کی طرف سے اپنی زبان پر جاری فرمایا، تو اب اگر کوئی مذنب ان کلمات کو کہے گا تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لسان پر تکلم ہوگا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ آپکی لسان کلیل نہیں تھی لہٰذا ان کلمات کی ادائیگی کے وقت مذنب کی لسان کو بھی کلیل نہ ہونا چاہئے۔ اسلئے کہ اب وہ کلام اپنی زبان سے نہیں کر رہا ہے بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لسان پر تکلم کر رہا ہے۔

لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دعا کے بعد اب کسی کا یہ خیال صحیح نہیں رہا چونکہ وہ مذنب ہے، جس کی وجہ سے اسکی زبان کلیل ہے۔ پس شاعر نے اس شعر میں جو مضمون ادا کیا ہے وہ اس اعتبار سے صحیح نہیں۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دعا فرمادینے کے بعد اب کسی مذنب کی لسان کلیل نہیں ہے۔

نیز میں یہ بات کہتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دعا سے معلوم ہوتا ہے کہ معصوم ہونے کے بعد بھی آپ سے اس قسم کے الفاظ جو صادر ہوئے تو یا تو غایت تواضع اور کسر وانکسار کی بناء پر صادر ہوئے، یا یہ بات تھی کہ یہ حضرات انبیاء علیہم السلام یہ سمجھتے تھے کہ طریق یہی ہے اسی سے طریق

میں داخل ہوا جاسکتا ہے۔ ؎

بدرگاہ لطف وبزرگیش بر — بزرگاں نہادہ بزرگی زسر

ترجمہ: حق تعالیٰ کے لطف وعظمت کے دربار میں بڑے بڑے لوگ اپنی بزرگی کا خیال نکال دیتے ہیں۔

بندہ اپنے مولا کے ساتھ جس قدر عجز وانکسار اور تواضع کرے کم ہی ہے، انبیاء علیہم السلام کو چونکہ حق تعالیٰ کی کامل معرفت ہوتی ہے اسلئے ان کے سامنے یہ حضرات اپنے کو قصور وار اور گنہگار ہی سمجھتے ہیں۔ اب آپ سے کہتا ہوں جب نبوت کا یہ طریق ہے تو ولایت تو بہرحال نبوت ہی کی فرع ہے اور اس کے تابع ہے، کوئی مستقل چیز نہیں ہے اس لئے کسی ولی کی مجال نہیں کہ اس راستہ کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ اختیار کرے۔ ؎

خلاف پیمبر کسے رہ گزید — کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

پیغمبر ﷺ کے خلاف جو شخص بھی راستہ اختیار کرے گا وہ ہرگز منزل مقصود تک نہیں پہنچے گا۔

عجب وپندار ابلیس کی صفت ہے

اور یہ جو میں نے کہا کہ راہ یہی ہے، تو اس کے متعلق یہ سمجھئے کہ سب سے پہلے عجب وپندار جس ذات نے کیا تھا وہ ابلیس تھا کہ اس نے اپنے کو حضرت آدم علیہ السلام کے مقابلہ میں ''انا خیر'' کہا اسی طرح سے فرعون نے بھی اسی کا اتباع کیا اور غایت تکبر اور ترفع میں آکر'' انا ربکم الاعلیٰ ''کہا اور

اس صفت میں ابلیس سے بھی بڑھ گیا کیونکہ ابلیس نے جو کلمہ کہا تھا وہ تو حضرت آدم علیہ السلام کے مقابلہ میں کہا تھا۔ اور اس بدبخت نے تو براہ راست حضرت حق جل وعلا سے مقابلہ کیا اور اپنے کو رب اعلیٰ کہا۔ چنانچہ اس کلمہ کی وجہ سے دونوں کا جو حشر ہوا وہ معلوم ہی ہے۔ یعنی یہ کہ ابلیس ملعون ہوا اور فرعون بھی مردود ومطرود ہوا۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کے سامنے ایک جانب تو یہ نقشہ موجود تھا اور دوسری جانب حق تعالیٰ کی عظمت اور ان کی بڑائی کے آگے یہ حضرات اپنا وجود ہی کچھ نہیں سمجھتے تھے۔ اس لئے ان حضرات نے عجب کو تو ترک فرما ہی دیا تھا۔ مزید یہ کیا کہ اپنے کو حق تعالیٰ کے سامنے نہایت ہی عاجز اور مسکین، مذنب اور ذلیل، حقیر اور معترف بالذنب کی حیثیت سے پیش کیا۔ جس کا منشاء ایک تو ابلیس کا واقعہ بنا اور دوسرے یہ کہ ان حضرات کو حق تعالیٰ کی عظمت ومعرفت ہوتی ہے۔ حق تعالیٰ کی عظمت اور ان کا جلال ان کے قلوب پر مستولی (غالب) رہتا ہے۔

چنانچہ جس قدر عظمت قلب میں ہوتی ہے اسی قدر انسان اپنے کو حق تعالیٰ کے سامنے حقیر وفقیر سمجھتا ہے۔ اسی سے خیال فرمایئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اطہر میں حق تعالیٰ کی کیسی کچھ عظمت تھی اس کا تو ہمیں اندازہ بھی نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ ایک باطنی شئی ہے۔

باقی یہ کہ قلبِ مؤمن چونکہ اللہ تعالیٰ کی تجلی گاہ ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خلاصۂ کائنات اور سبب تخلیق عالم ہیں اس لئے آپ کے قلب انور پر حق تعالیٰ کی جیسی کچھ تجلی ہوتی رہی ہوگی وہ ظاہر ہے۔ اس کا سراغ آپ کے

ان کلمات ہی سے لگتا ہے جو آپ نے استعمال فرمایا۔ مثلاً یہی فرمائے کہ: **انا البائس الفقیر المستغیث المستجیر** الخ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ان کلمات سے یہ معلوم ہوا کہ ایسے مواقع میں آدمی 'انا' کا استعمال کر سکتا ہے اور یہ وہ انا نہیں ہے جو مذموم ہے۔

اَنَا کی تحقیق کہ کب کہہ سکتے ہیں

جی چاہتا ہے کہ اس موقع پر مرقاۃ سے انا کہنے کی بحث کو نقل کروں۔ حضرت ملا علی قاریؒ نے اس مقام پر نہایت عمدہ کلام فرمایا ہے جو تحقیق بلیغ ہونے کے علاوہ پرلطف اور کیف آور بھی ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات صحابہ سے دریافت فرمایا کہ تم میں سے آج کون شخص روزہ دار ہے؟ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا 'انا' (میں) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اچھا آج تم میں سے جنازہ کے پیچھے کون چلا ہے؟ حضرت ابوبکرؓ نے پھر عرض کیا کہ میں، پھر آپ نے فرمایا کہ اچھا آج تم میں سے کس نے کسی مریض کی عیادت کی ہے؟ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا کہ میں نے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس انسان میں یہ تمام خصلتیں جمع ہوں وہ جنتی ہے۔ (مشکوۃ شریف ج۱)

حضرت ملا علی قاریؒ نے علامہ طیبیؒ کے حوالہ سے نقل فرمایا ہے کہ (قال ابو بکر 'انا') میں جو 'انا' آیا ہے تو اس سے اِخبار (خبر دینے میں) میں تعیین مقصود تھی۔ کچھ اپنے کو لگانا اور جتانا مقصود نہ تھا۔ جیسا کہ مقام مفاخرت میں

لوگ یہی کرتے ہیں اور حضرات صوفیہ کے نزدیک 'انا' کا یہی استعمال منع ہے۔ ورنہ تو لفظ انا خود نص میں وارد ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے کہنے کا حکم فرمایا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ "قُلْ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ" یعنی فرما دیجئے کہ میں تمہارے ہی جیسا ایک بشر ہوں۔

اسی طرح ارشاد ہے کہ "وَمَا اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ" علاوہ اس کے اور بھی بہت سی نصوص ہیں جن میں 'انا' کا لفظ آیا ہے۔ اور وہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک صحابی پر نکیر منقول ہے جنھوں نے دروازہ کھٹکھٹایا تھا اور جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ کون؟ کہا 'انا' (میں) تو اس موقع پر نکیر اس وجہ سے تھی کہ مقام اخبار میں انھوں نے تعیین نہیں کی یعنی جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کون تو انھیں اپنا نام بتلانا چاہئے تھا۔ محض (میں) کہہ دینے سے تعیین تو نہیں ہوئی اس سے زیادہ یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ کوئی پکارنے والا پکار رہا ہے، تو محض اس اتنے پر دلالت تو کنڈی کھٹکھٹانے سے بھی ہوگئی تھی، نیز لفظ 'انا' میں تو عموم ہے یعنی ہر شخص انا کہہ سکتا ہے۔ آگے خود صاحب مرقاۃ فرماتے ہیں۔

حاصل اس کا یہ ہے کہ انا اپنی ذات کے اعتبار سے تو مذموم نہیں ہے مگر اسکی مذمت جو کی جاتی ہے تو اس وقت جب کہ اس کے ذریعہ سے فخر کی باتوں کی خبر دے۔ جیسے ابلیس نے "اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ" کہا تھا۔ یا فرعون نے "اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى" کہا۔ چنانچہ اسی قبیل سے ہے اگر کوئی شخص آج یوں کہے "**انا العابد، انا الزاهد، انا العالم**" کیونکہ اس میں وہ متبع ہوگا ابلیس اور

فرعون کا بخلاف اس کے کہ اگر یوں کہے " **انا الفقیر، انا الحقیر، انا العبد، انا المذنب** "یا اسکے مثل اور کوئی لفظ کہے تو یہ تواضع شمار ہوگی جو کہ سنت ہے، اور یہ شخص اس باب میں متمسک بالسنۃ ہوگا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع سلوک میں بھی ضروری ہے۔ اور متبع سنت اس لئے ہوگا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے متعلق یہی فرمایا تھا **انا البائس الفقیر الخ**

سلوک میں بھی اتباع سنت ضروری ہے

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ان کلمات کا منشاء عظمت الٰہی کی تجلی تھی۔ دوسروں کو وہ کہاں نصیب۔ انبیاءؑ کا سا حال دوسروں کا ہونا تو محال ہی ہے۔ بایں ہمہ مؤمن کے لئے ان کلمات کو اپنی زبان سے کہنا ضروری ہوتا ہے، کیونکہ راہ یہی ہے۔ چنانچہ بزرگان دین فرماتے ہیں کہ طریق میں پہلا قدم نفس کا فنا ہے۔ اسی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عمل اور حال کے ساتھ پیش فرما رہے ہیں۔ یہ انا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے جو دراصل فنا ہے، اب یہ چاہو کہ محض اپنی کوشش سے بدون حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کے حق تعالیٰ تک پہونچ جاؤ تو یہ ناممکن ہے۔

مپندار سعدی کہ راہ صفا — تواں رفت جز بر پئے مصطفیٰ
خلاف پیمبر کسے رہ گزید — کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

اور یہ سمجھئے کہ راستہ بالکل بند ہے وہ اتباع سنت سے ہی کھلے گا اور کتاب وسنت کی روشنی میں ہی طے ہوگا۔ **قال اللہ تعالیٰ : لَقَدْ کَانَ**

لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ (سورۃ الاحزاب:۲۱) تم لوگوں کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک عمدہ نمونہ موجود تھا۔

وقال اللہ تعالیٰ قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ. (سورہ آل عمران:۳۱) آپ فرما دیجئے کہ اگر تم اللہ تعالی سے محبت رکھتے ہو تو تم لوگ میری اتباع کرو اللہ تعالی تم سے محبت کرنے لگیں گے۔

وقال اللہ تعالیٰ. وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّیْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰی رَسُوْلِنَا الْبَلَاغُ الْمُبِیْنُ. (سورہ التغابن:۱۲) اور اللہ کا کہنا مانو اور رسول کا کہنا مانو، سو اگر تم اعراض کرو گے تو ہمارے رسول کے ذمہ صرف صاف صاف پہونچا دینا ہے۔

پس اتباع میں یہ بھی ضروری ہے کہ انانیت کو فنا کیا جائے چنانچہ وہ انانیت جو ابلیس اور فرعون نے کی تھی انبیاء علیہم السلام کو تو اس سے نفرت تھی اس لئے آپ کے بعد پھر تمام ہی صوفیہ اس پر تل گئے کہ اس خودی کو اپنے اندر سے ہٹا کر رہیں گے کیونکہ انھوں نے ابلیس اور فرعون کو دیکھا تھا کہ وہ اسی انانیت کے ہاتھوں تباہ ہوئے۔ لہٰذا ان حضرات نے اس سے عبرت حاصل کر کے یہ نصیحت گرہ باندھ لی تھی کہ یہ راہ نہیں چلنا ہے۔ اور اس کے ساتھ اتصاف تو بجائے خود رہا اس کے شبہ اور شائبہ سے بھی یہ لوگ کوسوں دور رہے۔

مولانا رومؒ نے بھی مثنوی میں اس مضمون کو بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ ؎

زاں انائے بے انا خوش گشت جاں — شد جہاں از من انائے ایں جہاں

از انا چورست اکنوں شد انا   آفریں ہا بر انائے بے عنا

ترجمہ: اس بے انانیت سے میری جان خوش ہوگئی (یعنی ذات حق سے وابستگی ہو گئی) تو اس دنیا کی انا مجھ سے فنا ہوگئی۔ جب انانیت سے چھوٹ گیا تو درحقیقت اب انا کہنے کے لائق ہوا، اس بے مشقت والی انا پر سیکڑوں مبارکباد۔

مضمون کی پاکیزگی میں کیا کلام ہے مگر بالکل چیستاں بن کر رہ گیا ہے، برخلاف اس کے علماء نے جو کلام فرمایا ہے وہ کتنا صاف اور واضح ہے۔ اسی طرح مثنوی کا ایک اور شعر بھی بہت مشہور ہے۔ مولاناؒ فرماتے ہیں ؎

گفت فرعونے انا الحق گشت پست   گفت منصورے انا الحق گشت مست

ترجمہ: فرعون نے انا الحق کہا تو پست ہوگیا منصور نے انا الحق کہا تو مست ہوگیا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کے حالات مختلف ہیں۔ دیکھئے جس کلمہ کو فرعون کہہ کر مردود ہوا اور حضرت منصورؒ نے بھی اسی کلمہ کو کہا مگر وہ مجذوب اور اللہ کے محبّ قرار پائے۔ مولانا رومؒ نے اس شعر میں انا کی دونوں قسموں میں خوب اچھا فرق بیان فرمایا ہے، مگر انا والی حدیث میں علماء نے جو کلام فرمایا ہے وہ مولانا رومؒ کے بیان سے بھی بڑھ کر ہے۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے تھے کہ فرعون اور حضرت منصورؒ کے ان اقوال میں فرق اللہ کی طرف سے نہایت عمدہ مضمون القاء ہوا ہے۔ وہ یہ کہ فرعون نے جو انا کہا تو اس سے اس کا مقصد حق کی نفی اور انا کا اثبات تھا۔ چنانچہ اس نے **انا ربکم الاعلیٰ** (میں تمہارا رب اعلیٰ ہوں) جو کہا تو اس کی غرض یہ تھی کہ جو ذات کہ رب اعلیٰ کا مصداق ہوسکتی ہے وہ میں ہوں۔ میرے

علاوہ کوئی دوسرا رب نہیں۔ اور منصور نے جو انا الحق کہا تو اس سے ان کا مقصد اپنے انا کی نفی اور حق کا اثبات تھا، یعنی میں کچھ نہیں۔ بس حق تعالیٰ ہی درحقیقت حق ہے۔ غرض علماء جب تصوف کے مسائل بیان کرنے پر آتے ہیں تو قرآن وحدیث سے اس کو مستنبط کر کے ایسا فرماتے ہیں کہ آنکھ کھل جاتی ہے، مگر چونکہ عموماً لوگ قرآن وحدیث نہیں سمجھتے اس لئے تصوف کے ان مسائل کو بھی نہیں سمجھتے۔

بہرحال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اس دعا کے ذریعہ امت کو جو تعلیم فرمائی تو امت نے بھی دل سے اس کو قبول کیا۔ چنانچہ مشائخ نے ہر زمانہ میں آپ کی اس مخصوص حال کی یاد تازہ فرمائی ہے۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حال کی تفسیر حال ہی سے کی۔ اور جس طرح علماء ظاہر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات واقوال کی شرح فرمائی ہے اسی طرح حضرات مشائخ نے آپ کے حال کی پوری پوری وضاحت فرمائی ہے۔ اور یہ بالکل صحیح ہے کہ حال کی شرح حال ہی سے کی بھی جاسکتی ہے۔ محض قول وفعل اس کیلئے کافی نہیں۔

چنانچہ دوسروں کے اندر حال اپنے حال ہی کے ذریعہ پیدا کیا جاسکتا ہے یا پھر اس شخص کے قال سے بھی حال پیدا ہوسکتا ہے جو خود صاحب حال ہے۔ اب میں آپ کے سامنے بزرگوں کے چند واقعات پیش کرتا ہوں جس سے اندازہ ہوگا کہ ان حضرات نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سنت کو بھی کیسا مضبوط پکڑا ہے۔ اگر وقتاً فوقتاً یہ حضرات اس کو نہ دہراتے ہوتے تو حال

کے ساتھ اتصاف تو الگ رہا اس کا علم بھی ہم سے رخصت ہو جاتا۔

اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حال کی شرح جسے آپ نے ''**انا البائس الفقیر**''، میں معلوم کی۔ خاندان نبوت ہی کے ایک اعلیٰ فرد اور ایک صاحبِ سلسلہ بزرگ کے واقعہ سے سنئے :۔

حضرت زین العابدینؒ و اصمعیؒ کا واقعہ

اصمعیؒ کہتے ہیں کہ ایک شب میں بیت اللہ شریف کا طواف کر رہا تھا۔ میں نے ایک نوجوان کو دیکھا کہ کعبہ کے پردوں سے لپٹ کر یہ اشعار پڑھ رہا تھا۔

یا من یجیب دعآء المضطر فی الظلم   یا کاشف الضر والبلویٰ مع السقم

ترجمہ: اے وہ ذات جو رات کی تاریکیوں میں مضطر کی دعا قبول فرماتے ہیں اور مصیبت اور غم کو بیمار سے دور فرماتے ہیں۔

قد نام وفدک حول البیت وانتبھوا   وانت یا حی یا قیوم لم تنم

ترجمہ: آپ کے پاس آیا ہوا وفد بیت اللہ کے ارد گرد پھرا بھی، اور پھر کر سو گیا، پھر وہ لوگ بیدار بھی ہو گئے۔ مگر اے حی و قیوم آپ ایسے ہیں کہ آپ کبھی نہیں سوتے۔

ادعوک ربی حزینا ھائما قلقا   فارحم بکائی بحق البیت والحرم

ترجمہ: اے رب میں آپ کو اس حال میں پکارتا ہوں کہ الم رسیدہ ہوں، پریشان حال ہوں، اور قلق والا ہوں۔ لہٰذا میرے رونے پر اپنے بیت اور حرم

کے صدقہ میں رحم فرما دیجئے۔

ان کان جودک لا یرجوہ ذوسفه   فمن یجود علی العاصین بالکرم

ترجمہ: آپ کی بخشش کی کوئی بیوقوف اگر بالفرض امید نہ کرے تو پھر گنہگاروں پر کرم و بخشش کون کریگا۔

یہ اشعار پڑھے اور پھر خوب روئے۔ پھر اس کے بعد اس طرح دعا کی:

الا ایھا المقصود فی کل حاجة   شکوت الیک الضر فارحم شکایتی

ترجمہ: اے وہ ذات جو کہ ہر حاجت میں ہمارا مقصود ہے، میں نے آپ کی طرف اپنی تکلیف بیان کر دی۔ پس میری تکلیف کو دور فرما دیجئے۔

الا یا رجائی انت تکشف کربتی   فھب لی ذنوبی کلھا واقض حاجتی

ترجمہ: اے وہ ذات جس سے میری امیدیں وابستہ ہیں۔ آپ ہی میرے رنج و غم کو دور کر سکتے ہیں۔ لہٰذا میرے سب گناہوں کو بخش دیجئے اور میری حاجت روائی فرمائیے۔

اتیت باعمال قباح ردیة   وما فی الوریٰ عبد جنیٰ کجنایتی

ترجمہ: میں آپ کے دربار میں نہایت ہی ردی اور قبیح اعمال لیکر حاضر ہوا ہوں۔ اور یہ سمجھتا ہوں کہ آپ کی مخلوق میں مجھ جیسا گنہگار بندہ کوئی اور نہ ہوگا۔

ا تحرقنی بالنار یا غایة المتیٰ   فاین رجائی ثم این مخافتی

ترجمہ: اے میری امیدوں کی انتہا اور میری آرزؤں کے منتہی کیا آپ مجھے آگ میں جلائیں گے، اگر بالفرض ایسا ہوا تو پھر میری امید کیا کام آئی، اور میرا خوف کیا کام آیا۔

یہ کہا اور زمین پر بیہوش ہو کر گر پڑے۔

حضرت زین العابدینؒ کی عاجزی وانکساری

اصمعیؒ کہتے ہیں کہ میں نے اس جوان کو قریب سے دیکھا تو حضرت زین العابدین علی بن حسین بن علی ابن ابی طالبؓ تھے۔ یہ دیکھ کر میں نے ان کا سر مبارک اپنی گود میں رکھا اور خود بھی رونے لگا۔ میرے آنسوؤں کے چند قطرے آپ کے رخسار پر گرے جس کی وجہ سے آپ نے آنکھیں کھول دیں اور فرمایا یہ کون ہے جو میرے اور میرے رب کے درمیان حائل ہو گیا ہے، اور مجھ پر ہجوم کر رکھا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت آپ کا غلام اصمعی ہے۔ اور کہا کہ اے ہمارے سید آپ تو اہل بیت نبوت اور معدن رسالت سے ہیں پھر اس قدر جزع وفزع کیوں؟ کیا اللہ تعالیٰ نے نہیں فرمایا ہے کہ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْراً. یعنی اے اہل بیت! اللہ تعالیٰ ارادہ کرتا ہے کہ تم سے گندگی دور کر دے اور تم کو خوب پاک کر دے۔

آپ نے فرمایا اے اصمعی یہ کیسی بات کہتے ہو؟ اللہ تعالیٰ نے تو جنت کو مطیعین کے لئے پیدا فرمایا ہے، اگر چہ وہ عبد حبشی ہی کیوں نہ ہو، اور دوزخ کو عاصیین کیلئے پیدا کیا ہے اگر چہ وہ سید وقریشی ہی کیوں نہ ہو۔ اور کیا اللہ نے یہ ارشاد نہیں فرمایا ہے کہ ''فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَلَا اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَّلَا يَتَسَاءَ لُوْنَ. جب نفخ صور ہوگا تو اس دن باہم نسب کام نہ آوے گا، اور نہ اس کے بارے میں ان سے سوال کیا جائیگا۔ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُه فَاُولٰئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ، وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُه فَاُلٰئِکَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْا اَنْفُسَهُمْ فِیْ جَهَنَّمَ خَالِدُوْنَ'' یعنی بلکہ جسکی نیکیوں کا پلہ بھاری ہوگا یہی لوگ فلاح پانے والے ہونگے۔ اور جنکی نیکیوں کا پلہ ہلکا ہوگا یہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنے نفسوں کو خسارہ میں ڈال رکھا ہے جو کہ جہنم میں ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔

سبحان اللہ! کس قدر پاکیزہ حال تھا آپ کے قلب اطہر کا اور اس میں بھی کس قدر متبع سنت تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حال کی تصویر بعد والوں کو اپنے حال سے دکھلا دی۔ اور جس حال سے خود متصف تھے نہ معلوم کتنے لوگوں کو متصف اور متأثر کر دیا ہوگا۔ چنانچہ یہ سلسلہ برابر چلتا ہی رہا اور چل ہی رہا ہے اگر چہ قلیل۔

سیدنا عبد القادرؒ کا خوف وخشیت

شیخ سعدیؒ بوستاں میں لکھتے ہیں کہ:۔

عبد القادر گیلانی را دیدند در حرم کعبہ روئے بر حصا نہادہ بود وگفت۔

حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کو لوگوں نے دیکھا کہ حرم شریف کی کنکریوں پر پیشانی رکھے ہوئے تھے اور یہ کہہ رہے تھے کہ ''اے خداوند بخشائے واگر مستوجب عقوبتم مرا روز قیامت نابینا برانگیز تا در روئے نیکاں شرمسار نباشم'' یعنی اے خداوند عالم مجھے بخش دیجئے اور اگر میں سزا ہی کا مستحق ہوں تو مجھے

روز قیامت نابینا اٹھائیو، تا کہ نیک لوگوں کے سامنے شرمندہ نہ ہوں۔

سبحان اللہ! کیا خوب حال تھا خوف ورجاء کے الفاظ سننے میں تو آتے ہیں مگر ان حضرات کے عمل وحال سے ان الفاظ کا مفہوم سمجھ میں آجاتا ہے۔ حضرت سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ زبردست اولیاء اللہ میں سے تھے۔ چنانچہ انہیں کا وہ واقعہ ہے کہ بغداد کی جامع مسجد میں منبر پر بیٹھ کر فرمایا تھا کہ میرا قدم تمام اولیاء اللہ کی گردن پر ہے۔ اور اولیاء اللہ نے اس کلمہ کو سنا اور اپنی اپنی جگہ فرمایا کہ بلکہ ہمارے سرآنکھوں پر ہے۔ ایسا تو حضرت کا مرتبہ تھا اور خشیت کا یہ عالم تھا کہ حرم شریف کی کنکریوں پر پڑے ہوئے رو رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ اے اللہ میرے گناہ بخش دے۔ حضرت کے اس حال سے پتہ چلتا ہے کہ طاعت نے اپنا اثر کیا تھا، اور اس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کی پوری معرفت قلب میں آگئی تھی۔ اور اس کے آگے اپنے کو انتہائی قصوروار اور گنہ گار سمجھ رہے تھے، اور حقیقی طاعت کا یہی اثر ہوتا ہے۔ اور اگر طاعت کے بعد تواضع، فروتنی، کسر وانکسار اور فنائیت نہ پیدا ہو تو سمجھنا چاہئے کہ عبادت میں اخلاص نہیں ہے۔ ایسوں ہی کے متعلق مولانا رومؒ فرماتے ہیں ۔

ایں کہ می بینی خلاف آدم اند　　نیستند آدم غلاف آدم اند

یعنی آدم علیہ السلام کی صفات تواضع، فروتنی، انکسار، عاجزی، انابت، توبہ واستغفار اور اعتراف ذنب تھیں۔ لہٰذا جس آدمی میں یہ صفات نہ ہوں تو بھلا وہ کیا آدمی ہے۔ کیونکہ فی الواقع آدمی وہی ہے جو صفات آدم کا حامل ہو اور باپ کی میراث سے جسے حصہ ملا ہو، ورنہ تو محض آدمی کی صورت پر سمجھا جائیگا

اور باپ کی میراث سے عاری ہوگا اور یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شیر کی کھال پہن لے تو بظاہر شیر معلوم ہوگا حقیقتاً شیر نہ ہوگا۔ آگے فرماتے ہیں ۔

میم واو میم ونون تشریف نیست　　لفظ مؤمن جز پئے تعریف نیست

یعنی مومن کے حروف میم، واؤ، میم، نون سے مومن کو شرف حاصل نہیں ہے بلکہ یہ تو محض تعریف کے لئے ہے۔ لہٰذا مومن حقیقۃً اس کو کہا جائیگا جس میں خاص مومن کی صفات ہوں۔ باقی منافق پر مومن کا اطلاق کیا جانا ایسا ہی ہے جیسے شیر کی کھال پہننے والے کو شیر کہہ دیا جائے۔ اب اس زمانہ میں اس قسم کے لوگ بہت ہو گئے ہیں۔ کیسا کیسا عمدہ سے عمدہ اپنا نام رکھتے ہیں مگر صفات غائب ہیں۔ انہی لوگوں کے متعلق مولانا رومؒ فرماتے ہیں ۔

کار شیطاں می کند نامش ولی　　گر ولی ایں ست لعنت بر ولی

ترجمہ: کام تو شیطان کا کر رہا ہے مگر نام اس کا ولی ہے۔ اگر اسی کو ولی کہتے ہیں تو ولی پر لعنت ہے۔

شیخ عبدالقادرؒ کی سیرت کی اتباع ضروری ہے

یہ کہہ رہا ہوں کہ حضرت شیخ عبدالقادر گیلانیؒ کے جو ماننے والے ہیں ان پر تو شیخ کی یہ سیرت حجت ہی ہے۔ پس اگر کسی کو اس سیرت میں سے کچھ حصہ نہ ملا ہو تو وہ ناحق ماننے کا دم بھرتا ہے۔ بزرگوں کے یہ واقعات اس لئے بیان کرتا ہوں تا کہ آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور آپ کے حال قلبی کا کچھ اندازہ ہو جائے اور معلوم ہو جائے کہ خوف وخشیت کیا چیز ہے۔

اور اللہ تعالیٰ سے بندوں کو کس قدر ڈرنا چاہئے۔اب لوگ ہم سے کہتے ہیں کہ عمل کے لئے بس قرآن کافی ہے۔ میں انہیں یہ جواب دیتا ہوں کہ ہاں بیشک کافی ہے مگر آپ نے اس کو کافی بنایا کب ہے؟ آخر اسی قرآن میں تو یہ ہے کہ ,,یَرْجُوْنَ رَحْمَتَہٗ وَیَخَافُوْنَ عَذَابَہٗ''(وہ لوگ اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں) آپ نے صرف اس کا ترجمہ دیکھ لیا ہوگا مگر اس کے مصداق کو کب سمجھنے کی کوشش کی ہے۔وہ مصداق تو معلوم ہوتا ہے بزرگوں کی سیرت سے۔اور میں آپ سے کہتا ہوں کہ کیا یہ خوف وغیرہ زبان کی صفت ہے یا قلب کا حال ہے؟ پھر آپ نے اس کی طرف کتنی توجہ کی ہے۔اور قلب کی جانب توجہ کرنے کی آپ کو کب فرصت ملی ہے؟ اب لوگ یہ چاہتے ہیں کہ دل کا کام بھی زبان سے لے لیں اور حال کی جگہ قال پیش کریں تو اس سے کام نہیں چلے گا۔ بزرگوں نے خود بھی حال پیدا کیا اور پھر اس کو دوسروں میں منتقل فرمایا ہے۔اور کسی چیز کی اشاعت کا یہی طریقہ بھی ہوتا ہے۔یعنی جب بڑے یہ چاہتے ہیں کہ چھوٹوں سے کام کرائیں تو پہلے اس کو خود کرنے لگتے ہیں۔ چنانچہ یہی مسنون بھی ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود یہ دعا فرمائی ''**اللھم لا مانع لِما اعطیت و لامعطی لِما منعت** '' ترجمہ: یا اللہ جس کو آپ دینا چاہیں اس کو کوئی روک نہیں سکتا اور جس کو نہ دینا چاہیں اس کو کوئی دے نہیں سکتا۔تو صحابہ کرامؓ نے بھی اس دعا کو سنا اسکی وجہ سے سب کے اندر یقین ہو گیا کہ بیشک مؤمن کا سب کام اللہ کی ہی اعانت سے ہوتا ہے۔اسی طرح حضرت سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ نے سب کے

سامنے جو یہ عمل کیا تو اسی لئے کہ سارے حاضرین اپنے اپنے یہاں جا کر اس کو نقل کریں۔اور تمام عابدین کیلئے شیخ کا یہ عمل تازیانہ کا کام کرے۔یعنی وہ یہ سمجھیں کہ جب اتنے بڑے کامل شیخ کی نظر اپنی طاعت پر نہیں ہے،تو ہم لوگ بھلا کیا اپنی طاعت پر نظر کریں۔اور شیخ سعدیؒ نے اس حکایت کو تو اپنی کتاب ہی میں لکھ دیا تا کہ ہر دور میں اس کا تذکرہ کم از کم زبان پر تو جاری رہے۔ کیونکہ جب زبان پر برابر آتا رہے گا تو امید کی جا سکتی ہے کہ یہ حال ایک دن قلب میں بھی اتر جائے گا۔ورنہ اگر واقعہ کتاب ہی میں لکھا نہ ہوگا تو پھر زبان پر بھی نہ آ سکے گا۔بس جب تک دیکھنے والے موجود ہوں گے اس وقت تک تو واقعہ کا چرچا رہے گا مگر ان دیکھنے والوں کے بعد چرچا بھی ختم ہو جائے گا کیونکہ قاعدہ ہے کہ صلاح کی باتیں صالحین کی ذات ہی تک رہتی ہیں اور جب یہ لوگ نہیں رہ جاتے تو باتیں بھی ختم ہو جاتی ہیں۔غرض شیخ حرمؒ کعبہ میں جو اس طرح روئے تو حاضرین کے قلوب کو ہلا دیا اور اپنے اس ایک رونے سے نہ جانے کتنی مخلوق کو خالق سے ملا دیا۔ یہ واقعہ گو دیکھنے میں ایک چھوٹا سا واقعہ تھا مگر اثر کے لحاظ سے اس وقت کے سب لوگوں اور بعد میں بھی کتنے لوگوں کے لئے اللہ تک پہونچنے کا ذریعہ بن گیا۔

آپ سے کہتا ہوں کہ جب یہ حال پیدا ہو جائے تو آپ کہیں بھی رہیں کچھ ڈر نہیں ہے۔ ہوائی جہاز میں اڑیں کہیں چلے جائیں کچھ مضائقہ نہیں۔ لیکن جب تک قلوب میں یہ کیفیت اور حال نہ پیدا ہو جائے آدمی کے الجھ جانے کے لئے ایک معمولی سا کانٹا بھی کافی ہے۔اور دنیا کی ہر چیز ہی کانٹا

ہے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے کسی کو اس سے محفوظ فرمالیں۔

اور میں نے جو یہ کہا کہ جب بڑے کوئی کام چھوٹوں سے لینا چاہتے ہیں تو پہلے خود اسے کرتے ہیں تا کہ چھوٹے بڑوں کی تقلید کریں۔ کیونکہ دستور ہے کہ اصاغر اپنے اکابر کی تقلید کرتے ہیں اور جب پیر ہی کسی کام کو نہیں کرتا تو مرید بھی اس کو نہیں کرتے بلکہ اس کی ذرا سی غفلت کی وجہ سے دوسرے لوگ عمل سے بہت دور جا پڑتے ہیں۔

حضرت شیخ الہندؒ کا واقعہ

ہم نے خود دیکھا کہ دارالعلوم دیوبند کے دارالحدیث کی عمارت بن رہی تھی۔ بنیادیں کھودی جا چکی تھیں کہ اچانک اس قدر بارش ہوئی کہ ساری بنیاد میں پانی بھر گیا جس کی وجہ سے دوسری عمارت کو بھی خطرہ لاحق ہو گیا۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ تشریف رکھتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ حضرت مہتمم صاحب نے آ کر حضرت دیوبندی سے صورت حال عرض کی۔ حضرت نے طلبہ سے کچھ بھی نہیں کہا بلکہ خود برتن لے کر پانی میں گھس پڑے اور باہر پھینکنے لگے۔ آپ کی دیکھا دیکھی سب ہی طلبہ پانی میں گھس پڑے اور چند گھنٹوں میں سارا پانی باہر نکال کر پھینک دیا۔

بہر حال یہ انسانی فطرت ہے کہ انسان اپنے بڑوں کی تقلید کرتا ہے اچھی چیزوں میں بھی اور بری چیزوں میں بھی۔ چنانچہ مشہور ہی ہے کہ خربوزہ کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ دیکھئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تواضع اور

انکسار اختیار فرمایا تو حضرت زین العابدین نے بھی اسی کو اختیار فرمایا اور پھر حضرت جیلانیؒ کے واقعہ میں بھی آپ نے اسے ملاحظہ فرمایا۔

حضرت معاویہؓ کی وصیت، قبل وفات

اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ سنئے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنا معاملہ کیسا درست کئے ہوئے تھے۔ چنانچہ عبداللہ سہمی روایت کرتے ہیں کہ ثمامہ بن کلثومؒ نے بیان کیا کہ حضرت معاویہؓ کا سب سے آخری خطبہ یہ تھا:۔

,,فرمایا کہ اے لوگو! میں اب تک تمہارا والی تھا اور یہ سمجھ لو کہ مجھ سے بہتر والی اب نہیں ملے گا۔ آئندہ جو بھی والی ہو گا وہ بدتر ہی ہو گا۔ یہ فرما کر یزید سے مخاطب ہو کر کہا کہ سنو! جب میری موت ہو جائے تو میرے غسل کا منتظم کسی سمجھ دار شخص کو بنانا اور خزانہ شاہی کھول کر اس میں سے وہ رومال نکال لینا جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک کپڑا اور کچھ موئے مبارک اور چند ٹکڑے ناخن مبارک کے بندھے ہوئے رکھے ہیں۔ پھر ان ٹکڑوں کو میری ناک، منہ اور آنکھوں میں رکھ دینا اور اس کپڑے کو میرے کفن کے اندر جسم سے ملا کر رکھ دینا اور والدین کے متعلق اللہ تعالیٰ کی وصیت کو یاد رکھنا اور میرا جنازہ قبرستان لے جا کر قبر میں رکھ کر معاویہ کو ارحم الراحمین کے سپرد کر دینا۔

سبحان اللہ! دیکھا آپ نے یہ ہیں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور یہ ہے

ان کی وصیت۔ زندگی میں بھی ان کی عجیب حالت رہتی تھی۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اور حضرات شیخینؓ کا دور یاد فرماتے تھے تو بہت روتے تھے اور یہ فرماتے تھے کہ معاویہ تو دنیا میں بالکل گھر کر رہ گیا ہے۔ اور میں نے کسی کتاب میں یہ بھی دیکھا ہے کہ فرماتے تھے کہ اللہ ابوبکرؓ پر رحم کرے وہ دنیا سے بالکل پاک وصاف تشریف لے گئے۔ یعنی نہ انھوں نے دنیا کا قصد کیا اور نہ دنیا نے ہی ان کا قصد کیا۔ اسی طرح اللہ عمرؓ پر رحم کرے کہ انھوں نے بھی دنیا کا قصد نہیں کیا لیکن دنیا نے انکا قصد کیا اور رہا معاویہ تو وہ دنیا میں بالکل لت پت ہی ہو گیا۔ یہ فرماتے اور زاروقطار روتے یہاں تک کہ آپ کی ڈاڑھی آنسوؤں سے تر ہو جاتی تھی۔ آخر تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہی، آپ کی تعلیمات اور آپ کی سیرت کا اثر قبول کئے ہوئے تھے۔ یعنی خوف وخشیت کی جو تفسیر حضور کے عمل سے دیکھی تھی اپنی سیرت میں بھی اس کو جاری فرمالیا تھا۔ یہ تو خوف کا حال تھا جو ساری زندگی رہا لیکن آخری حالت میں رجاء کو غالب کیا۔ چنانچہ رجاء میں ہی یہ فرمایا تھا کہ قبر میں معاویہ کو ارحم الراحمین کے حوالہ کر دینا۔ مطلب یہ ہے کہ وہاں کا معاملہ تو ارحم الراحمین ہی کے رحم وکرم سے حل ہوگا۔

بزرگوں کے اخلاقی واقعات

غرض یہی تواضع اور انکسار توبہ وانابت اور استغفار ہر زمانہ میں بزرگوں کا شعار رہا ہے۔ چنانچہ شیخ سعدیؒ نے گلستاں میں ایک باب ہی

''اخلاق درویشاں'' کا قائم فرمایا ہے اور اس میں بزرگوں کے ایسے ایسے واقعات لائے ہیں کہ سبحان اللہ کیا کہنا۔ طریق کو بالکل سمجھا دیا ہے اور بہت سے لوگوں کو اس کے ذریعہ سے ولی کامل بنا دیا ہے۔

چنانچہ فرماتے ہیں کہ:

''درویشے را دیدند کہ سر بر آستانۂ کعبہ می مالید و می نالید'' یعنی ایک درویش کو بزرگوں نے دیکھا کہ کعبہ کی چوکھٹ پر سر رگڑ رہا تھا اور رو رہا تھا ''و می گفت یا غفور یا رحیم تو دانی کہ از ظلوم وجہول چہ آید'' اور یہی کہتا تھا کہ اے غفور اے رحیم تو جانتا ہے کہ ظلوم وجہول سے کیا ہو سکتا ہے سوائے ظلم اور جہالت کے۔ مطلب یہ کہ آپ نے تو خود ہی اپنے کلام میں انسان کو ظلوم وجہول فرمایا ہے تو میں بھی اسی کا ایک فرد ہوں، اس لئے ظلم وجہالت میں مبتلا ہوں ۔

عذر تقصیر خدمت آوردم   کہ ندارم بہ طاعت استظہار

یعنی میں آپ کی خدمت میں اپنی کوتاہی کا عذر لیکر آیا ہوں اسلئے کہ طاعت کا تکیہ اور سہارا میرے پاس کچھ نہیں ہے۔

عاصیاں از گناہ توبہ کنند   عارفاں از عبادت استغفار

یعنی جو گنہگار ہیں وہ تو اپنے گناہ سے توبہ کرتے ہیں اور جو عارف ہیں وہ اپنی عبادت سے استغفار کرتے ہیں کیونکہ عارف ہونے کے سبب یہ سمجھتے ہیں کہ میری عبادت اس ذات کے شایان شان نہیں ہوئی۔ اسلئے وہ عبادت ہی کیا ہوئی، گناہ ہوا۔

''عابداں جزائے طاعت خواہند و بازرگاناں بہائے بضاعت'' یعنی جو

عابدلوگ ہیں وہ تو اپنی طاعت کا بدلہ چاہتے ہیں اور جو سوداگر ہیں وہ اپنی پونجی
کی قیمت چاہتے ہیں۔ ''من بندہ امید آوردہ ام نہ طاعت بدریوزہ آمدہ ام نہ
بتجارت'' مجھ غلام کے پاس کوئی طاعت نہیں ہے اس لئے امید لے کر حاضر
ہوا ہوں۔ سائل اور بھکاری بن کر آیا ہوں تاجر بنکر نہیں۔ لہٰذا میرے ساتھ وہ
معاملہ فرمائیے جو آپ کے شایان شان ہے نہ وہ کہ جس کے ہم مستحق ہیں۔

گر کشی ور جرم بخشی روئے سر بر آستانم ۔۔۔ بندہ را فرماں نہ باشد ہر چہ فرمائی بر آنم

یعنی آپ چاہیں تو مار ڈالیں یا میرا جرم بخش دیں میرا سر بہر حال آپ
کے آستانہ پر ہے۔ اور غلام کے لئے تو حکم چلانا ہوتا نہیں جو کچھ آپ کا حکم ہوگا
میں اس پر راضی ہوں۔

بر در کعبہ سائلے دیدم ۔۔۔ کہ ہمی گفت و می گرستی خوش
من نہ گویم کہ طاعتم بپذیر ۔۔۔ قلم عفو بر گناہم کش

میں نے کعبہ کے دروازہ پر ایک سائل کو دیکھا کہ یہی کہہ رہا تھا اور
رو رہا تھا کہ میں آپ سے یہ نہیں کہتا کہ میری طاعت قبول فرمالیجئے بلکہ یہ
درخواست کرتا ہوں کہ معافی کا قلم میرے گناہوں پر کھینچ دیجئے۔ (گلستاں ص ۷۱)

اور سنئے بزرگوں نے جب راستہ کا سراغ لگالیا کہ طریق نام ہے تواضع
کا اور فنا کا تو پھر اللہ کے بندوں نے اپنے کو ایسا مٹایا ہے کہ جس کی نظیر ملنی
مشکل ہے۔ یعنی اس امر کے پیش نظر رکھنے کے بعد انھوں نے اپنے کو سب
سے حقیر اور کمتر جانا ہے۔ اور باوجود محفوظ ہونے کے اور کثرت طاعت کے
خود کو گنہگار ہی سمجھا ہے۔

حضرت ذوالنون مصریؒ کا واقعہ

چنانچہ حضرت ذوالنون مصریؒ کا واقعہ بوستاں میں مذکور ہے کہ ایک سال
مصر کے دریائے نیل میں پانی نہیں تھا جس کی وجہ سے قحط کے آثار ظاہر
ہوئے کچھ لوگ کہسار کی طرف بارش طلب کرنے کے لئے نکلے بہت روئے
دھوئے مگر آسمان کو ان کے حال زار پر رونا نہ آیا یعنی بارش نہ ہوئی۔ حضرت
ذوالنون مصریؒ کو بھی مخلوق کی پریشانی کی اطلاع کی گئی اور عرض کیا گیا کہ
آپ بھی اللہ تعالیٰ سے دعا فرمادیجئے کہ اللہ کے مقبول بندے ہیں اور مقبولین
کی دعا رد نہیں ہوتی۔ شیخ لکھتے ہیں کہ میں نے سنا کہ یہ سن کر حضرت ذوالنون
مصریؒ مدین کی طرف روانہ ہوگئے۔ چنانچہ ان کا شہر مصر سے نکلنا تھا کہ بارش
شروع ہوگئی اور انھیں مدین پہونچ کر اس کی اطلاع ہوئی کہ بارش ہو چکی
ہے، اور دریا پانی سے لبریز ہوگیا۔ کسی عارف نے ان سے تنہائی میں
پوچھا کہ آپ کے مصر سے چلے جانے میں کیا راز تھا فرمایا کہ میں نے سنا تھا
کہ قحط جو ہوتا ہے تو وہ برے لوگوں کے اعمالِ بد کی وجہ سے ہوتا ہے اور میں
نے اس معاملہ میں غور کیا تو اپنے سے زیادہ کسی کو اس بستی میں گنہگار و بدعمل
نہیں پایا۔ اس لئے میں وہاں سے چلا گیا کہ خواہ مخواہ میری نحوست کا خمیازہ یہ
لوگ کیوں بھگتیں۔

سبحان اللہ! یہ ہے آپ کے اسلاف کی سیرت کہ اپنے کو سب سے زیادہ
گنہگار سمجھتے تھے مگر یہ وہی حضرت ذوالنون ہیں جن کی شکایت کسی نے بادشاہ

سے کر دی تھی۔ اس لئے اس نے انھیں بلوا بھیجا۔ لیکن جب ان سے گفتگو کی تو
ان کے علم و فضل اور بزرگی کا اسے اندازہ ہوا۔ اور بہت معتقد ہو گیا جس کی وجہ
سے بڑی عزت کے ساتھ پیش آیا اور یہ کہا کہ جس مجلس میں اولیاء اللہ کا ذکر کیا
جائے اور اس میں ذوالنون مصریؒ کا ذکر نہ کیا جائے تو بڑے ظلم کی بات ہے۔

اس واقعہ کے متعلق حضرت مولانا تھانویؒ سے کسی نے عرض کیا کہ
حضرت ذوالنون مصریؒ نے یہ جو فرمایا کہ میں سب سے زیادہ گنہگار ہوں تو یہ
بظاہر خلاف معلوم ہوتا ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ شاید صحیح کہتے ہوں۔ حضرت
مولانا تھانویؒ سے دریافت کرنے کی ہمت تو نہ پڑی کہ آخر اس کا کیا مطلب
ہے؟ مگر بعد میں سمجھ میں آ گیا وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کے انعامات و احسانات جو ان
حضرات پر ہوتے ہیں ان کے مقابلہ میں باوجود طاعت و عبادت کرنے کے
یہ حضرات اپنے کو گنہگار و قصوروار ہی سمجھتے ہیں۔ اس لئے حضرت ذوالنونؒ نے
اسی حال میں یہ فرمایا۔ بندے کو ایسا سمجھنا ہی چاہئے۔

ف: یہ حقیر قمرالزمان عرض پرداز ہے کہ باوجود ذکر و شغل اور طاعات کے
حضرت ذوالنون مصریؒ کا اپنے کو گنہگار سمجھنا اور اپنے گناہوں کا اعتراف کرنا
درحقیقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت جو گناہوں کے اعتراف کے سلسلہ
میں تھی اس کی اقتداء ہے، اور یہ زبان ہی سے نہیں بلکہ عمل و حال سے کر کے
دکھایا کہ اپنے وطن کو چھوڑ کر دوسری جگہ چلے گئے۔ تو اس اتباع سنت کی وجہ
سے اللہ کو پیار آ گیا اور بارش سے امت کو سیراب کر دیا۔ انتہی

ان واقعات کے سننے سے آپ کو بھی اندازہ ہوا ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم نے "انا البائس الفقیر" کے ذریعہ جو تعلیم امت کو دی تھی امت
نے اسے سیکھا اور اس امر میں بھی متبع سنت ہوئی اور آپ تو تھے معصوم، پھر بھی
جو اس طرح سے دعا مانگی تو مقصود اس سے یہی تھا کہ امت کو دعا کا طریقہ، تعلیم
فرمائیں۔ چنانچہ اگر آپ عمل کر کے خود نہ بتلا دیتے اور محض قال پر اکتفاء
فرماتے تو کسی کو اس کا خاص طریقہ ہی معلوم نہ ہوتا، مگر آپ کی تعلیم کے بعد
سب کے لئے آسان ہو گیا، اور امت کو یہ معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کا راستہ اسی
طرح طے کیا جاتا ہے، ورنہ تو ہم لوگ اعتراف ذنب کی فضیلت سنتے لیکن
اس پر عمل کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ یہی کرتے کہ زبان سے کہہ لیتے کہ
یا اللہ ہم اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں، مگر یہ بات کہ اعتراف میں قلب
کا کیا حال ہونا چاہئے اور طرز اعتراف کیا ہونا چاہئے یہ سب کچھ سمجھ میں نہ
آتا مگر جب آپ نے خود مناجات کر کے اعتراف ذنب کا طریقہ بتایا تو اس
سے یہ معلوم ہوا کہ امت کو خواہ عاصی ہو یا مطیع، عابد ہو یا مذنب سبھی کو اعتراف
ذنب کرنا چاہئے۔ اور یہ سب کے لئے لازم ہے اور اس میں انتہائی تضرع
وزاری اور غایت مسکنت و انکساری ہونی چاہئے اور یہ بھی نبی اکرم صلی اللہ
علیہ وسلم کی خاص سنت ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے۔

گر نہ بودے ذات پاکت اندریں رہ مقتدا   پے نہ بردے ہیچ کس تا منزل حق الیقین

ترجمہ: حق الیقین کی منزل تک کسی کی رسائی ہو نہیں سکتی تھی اگر آنحضرت صلی
اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک اس راہ میں پیشوا نہ ہوتی۔

اور اس میں شک نہیں کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی عملی تعلیم نہ

فرماتے تو کسی کی سمجھ میں نہ آتا کیونکہ یہ مشکل چیز تھی بالخصوص عابدین کے لئے کہ کریں عبادت اور سمجھیں اپنے آپ کو مذنب، یہ بہت مشکل تھا، کسی فقیر اورمحتاج کا خود کو محتاج سمجھنا آسان ہے، مگر کسی مالدار کا اپنے آپ کو فقیر سمجھنا بہت مشکل ہے۔ اسی طرح کسی گنہگار کا اپنے کو خطاوار سمجھنا نہایت آسان بات ہے مگر کسی عابد کا اپنے کو گنہگار سمجھنا اور اپنی عبادت سے صرف نظر کر لینا آسان کام نہیں ہے۔ یہ اسی وقت ہوسکتا ہے کہ جب کسی کو اللہ تعالیٰ کی کامل معرفت ہی حاصل ہو جائے اور وہ یہ سمجھے کہ میری کوئی عبادت اللہ تعالیٰ کی جناب کے شایان شان نہیں یا یہ کہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہی اس کے شامل حال ہو جائے تو سب آسان ہے۔

انبیاء علیہم السلام باوجود معصوم ہونے کے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں

حضرات انبیاء علیہم السلام کو چونکہ اللہ تعالیٰ کی کامل معرفت ہوتی ہے اس لئے باوجود عبادت اور غایت قرب بلکہ عصمت کے بھی وہ اپنے کو اللہ تعالیٰ کا محتاج اور خود کو سراپا خطاکار ہی سمجھتے ہیں اور دوسروں کی تعلیم کے لئے اس طرح دعائیں کر کے اپنا عجز وانکسار اپنی مسکنت وافتقار کو ظاہر فرماتے ہیں۔ چنانچہ انبیاء علیہم السلام کے جو سچے جانشین ہوتے ہیں ان کا بھی یہی حال ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے پورے مطیع ہوتے ہیں اور اپنا سارا وقت اسی کی طاعت اور اسی کی رضا کے کاموں میں صرف کرتے ہیں۔ (مگر اپنے کو

قصوروار ہی سمجھتے رہتے ہیں) یہ بھی عجیب بات ہے کہ ہم لوگ شب وروز معصیت میں منہمک رہتے ہیں مگر افسوس کہ ہمیں دوزخ بھول کر بھی یاد نہیں آتی۔ اور یہ ایسا ہی ہے جیسے کہ منافق کہ وہ جہنم میں ضرور جائے گا، جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے ”اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْکِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ“ (بے شک منافق جہنم کے نچلے طبقہ میں ہوں گے) مگر اس کو اس کا خطرہ بھی نہیں گذرتا کہ ہم جہنم میں جائیں گے، برخلاف مؤمن کے کہ وہ نفاق سے بری ہوتا ہے مگر ہر وقت وہ اپنے اوپر نفاق کا خوف کرتا رہتا ہے۔

بہرحال حقیقی طاعت کا یہی اثر ہوتا ہے کہ انسان خود اپنے میں کوئی کمال نہیں دیکھتا۔ ورنہ تو اگر طاعت کے بعد تواضع وفروتنی اور کسر وانکسار نہ پیدا ہو تو سمجھنا چاہئے کہ اس کی عبادت میں اخلاص نہیں ہے۔

چنانچہ نیک لوگوں میں خواہ عالم ہوں یا عابد بس یہی روگ لگ جاتا ہے جس کی وجہ سے ان کی یہ ظاہری نیکی ہی ان کے لئے وبال جان ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس علم وعبادت کا ایسا نشہ ہوتا ہے کہ اس کے وجہ سے آدمی نہ اپنی ہی رعایت کرتا ہے نہ دوسرے کی بلکہ اس کا ضرر لازمی بھی ہو جاتا ہے اور متعدی بھی۔ اس کی تائید میں آپ کے سامنے حضرت سیدنا رفاعیؒ کا قول نقل کرتا ہوں جو اپنے وقت کے درویش کامل تھے۔

فقہاء کے درجات قائم کر کے فرماتے ہیں کہ ”تیسرا درجہ اس شخص کا ہے جس نے مشکل مسائل کو حل کیا۔ منقولات ومعقولات کی باریک باتیں معلوم کیں مناظرہ کے دریاؤں میں گھس گیا اور ان تمام باتوں میں اس کی نیت یہ

ہے کہ علم حاصل کر کے شریعت کی مدد کریگا مگر اس کے اندر غرورِ علم ہے۔علم کی وجہ سے دوسروں کو اپنے سے کم سمجھتا ہے۔جب کسی مسئلہ میں شریعت کی حمایت کو کھڑا ہوتا ہے اس وقت اگر کوئی اس کی دلیل پر اعتراض کر دے تو اپنے نفس کی حمایت میں ایسا مغلوب ہو جاتا ہے کہ حد سے نکل جاتا ہے اور مدمقابل کے خلاف دلیلیں قائم کرنے لگتا ہے، اس کو برا کہنے لگتا ہے اور بعض اوقات اس کو کافر بنا دیتا ہے، اس پر طعن کرنے لگتا ہے، اور ایسا حملہ کرتا ہے جیسا درندہ شکار پر حملہ کیا کرتا ہے، شریعت کے مقررہ حد کی بالکل رعایت نہیں کرتا، نہ اپنے حالات میں نہ اس مدمقابل کے معاملات میں''۔ (انتہیٰ)

بس مجھے یہاں یہی دکھلانا ہے کہ ایسا شخص اپنی رعایت نہیں کرتا اور نہ اپنے مدمقابل کی۔یعنی ضرر اس کا لازمی بھی ہوتا ہے اور متعدی بھی۔یعنی دوسروں تک اس کا ضرر پہنچتا ہے۔

حدیث میں جو واقعہ مذکور ہوا اسی نوع کا ایک واقعہ شیخ سعدیؒ نے بوستاں میں لکھا ہے اس کو میں کچھ شرح کے ساتھ بیان کرنا چاہتا ہوں اور اس قسم کی باتیں وضاحت کے ساتھ اس لئے بیان کرتا ہوں تاکہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ اخلاق کسے کہتے ہیں اور اس میں کیا فائدہ ہے اور بداخلاقی کسے کہتے ہیں اور اس میں کیا نقصان ہے۔اور ہمارے اسلاف کس چیز کو دین سمجھتے تھے اور کس کو نہیں۔مگر افسوس کہ آج کل اپنے اسلاف کی تعلیمات کی جانب اصلاً التفات نہیں کرتے اس لئے جیسے ابتداء میں بدخلق رہتے ہیں ویسے ہی بزرگوں کی صحبت میں مدتوں رہنے کے بعد بھی رہ جاتے ہیں۔

عابد ناپارسا و عاصی خائف کا واقعہ

شیخ سعدیؒ نے اس واقعہ کو حکایت حضرت عیسیٰ علیہ السلام و عابد ناپارسا کے عنوان سے بیان فرمایا ہے۔وہ یہ ہے۔

شنیدستم از راویان کلام   کہ در عہد عیسیٰ علیہ السلام
یکے زندگانی تلف کردہ بود   بجہل وضلالت سرآوردہ بود
دلیرے سیہ نامۂ سخت دل   زناپاکی ابلیس ازوے خجل

یعنی اہل تاریخ سے میں نے سنا ہے کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں ایک شخص تھا جس نے اپنی زندگی برباد کر رکھی تھی یعنی جہالت اور گمراہی میں تمام عمر گذار دی تھی۔جری، بیباک، سخت دل اور نامۂ اعمال اس کا بالکل سیاہ، ایسا کہ اس کی ناپاکی کے آگے ابلیس بھی شرمندہ تھا۔اس کے یہ اوصاف شیخ بیان کر رہے ہیں اور آگے دیکھئے گا کہ اسی نے میدان جیت لیا اور ایسی پاکی میں آگیا کہ ابلیس اس کے حال کو دیکھ کر منہ کے بل گر گیا ہوگا، اور اپنے پنجہ سے اس کے چھوٹ جانے پر ساری عمر رویا ہوگا۔معاملہ اللہ تعالیٰ کے اختیار کا ہے۔اس شخص نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صرف ایک بار اور وہ بھی دور سے دیکھا تھا اور اس کی یہ حالت ہوئی کہ کامیاب ہو گیا اور آگے آتا ہے کہ اس پارسا کے پاس حضرت عیسیٰ علیہ السلام نہ جانے کتنی بار تشریف لائے ہوں گے لیکن اس کا دوسرا ہی انجام ہوا۔اس کے بعد شیخ یوں بیان فرما رہے ہیں کہ

شنیدم کہ عیسیٰ درآمد زدشت   بمقصورۂ عابدے برگذشت

بزیر آمد از غرفہ خلوت نشیں　　بپایش در افتاد سر بر زمیں
گنہ گار برگشتہ اختر زدور　　چوں پروانہ حیران درایشاں زنور
تامل بحسرت کناں شرمسار　　چوں درویش دردست سرمایہ دار

یعنی میں نے سنا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جنگل سے تشریف لا رہے تھے۔ آپ کا گذر ایک عابد کے عبادت خانہ پر ہوا۔ آپ کو دیکھ کر عابد خلوت نشیں بالا خانہ سے نیچے آیا اور حضرت کے قدموں پر اپنا سر رکھدیا اور ادھر وہ بدنصیب گنہ گار دور ہی سے ان دونوں کے معاملہ کو دیکھ کر حیران ہو رہا تھا جس طرح کہ پروانہ نور اور روشنی کو دیکھ کر بیتاب ہو جاتا ہے۔ دل ہی دل میں شرمندہ ہو رہا تھا اور حسرت کی نگاہوں سے ان کو اس طرح تکتا تھا جیسے کوئی غریب کسی امیر کے ہاتھ کو بہ نظر حسرت تک رہا ہو۔ پھر کچھ دور چل کر شیخ فرماتے ہیں کہ وہ زار و قطار رو رہا تھا اور کہہ رہا تھا ۔

گناہم بہ بخش اے جہاں آفریں　　کہ گر بامن آید فبئس القریں

یعنی اے پروردگار میرے گناہ بخش دے کیونکہ قیامت میں بھی اگر وہ گناہ میرے ساتھ رہا تو نہایت ہی برا ساتھی ہوگا۔ یہ تو اس گنہگار کا حال تھا اب پارسا کا حال سنئے ۔

دریں گوشہ نالاں گنہگار پیر　　کہ فریاد حالم رس اے دستگیر
وزاں نیمہ عابد سر پر غرور　　ترش کردہ بر فاسق ابروز دور
کہ ایں مدبر اندر پئے ماچراست　　نگوں بخت ناداں چہ ہمجنس ماست

یعنی ادھر تو اس گوشہ میں یہ بڈھا گنہگار رو رہا تھا اور کہتا تھا کہ اے خدا

میری دستگیری فرما اور دوسری جانب وہ عابد جس کا سر غرور سے پُر تھا دور ہی سے اس گنہگار غریب کو دیکھ دیکھ کر چیں بجبیں ہو رہا تھا اور کہتا تھا کہ یہ بدبخت ہمارے پیچھے کیوں لگا ہے۔ جاہل ہے بدنصیب ہے ہم سے اس کو نسبت ہی کیا ہے۔ ذرا آگے چل کر شیخ نے اس کا یہ مقولہ بھی نقل کیا جو اس نے انتہائی تکبر اور غرور میں کہا تھا۔ کہتا تھا ۔

ہمی رنجم از طلعت ناخوشش　　مبادا کہ درمن فتد آتشش
بہ محشر کہ حاضر شود انجمن　　خدایا توبہ او مکن حشر من

یعنی میں اس کے برے دیدار سے اس لئے رنجیدہ ہوں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی آگ میں سے کچھ مجھ پر بھی پڑ جائے سوائے خدا محشر کے روز جب کہ ساری دنیا حساب و کتاب کے لئے جمع ہوگی تو میرا حشر اس گنہگار کے ساتھ نہ کیجئے۔

دیکھئے یہی وہ حالت ہے جس کے متعلق سیدنا رفاعیؒ نے فرمایا ہے کہ انسان کبھی نہ اپنی رعایت کرتا ہے نہ اپنے مدمقابل کی۔ یہاں بھی اس عابد ناپارسا نے نہ اپنی رعایت کی کیونکہ سر میں پندار رکھا اور گنہگار کی تحقیر کی، اور نہ اس کی رعایت کی، بلکہ جو منہ میں آیا کہا۔ ان سب کا برا ہونا ظاہر ہے۔ آگے شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں کہ ۔

دریں بد کہ وحی از جلیل الصفات　　در آمد بعیسیٰ علیہ الصلوت
کہ گر عالم ست آں وگروے جہول　　مرا دعوت ہر دو آمد قبول
عفو کردم از وے عملہائے زشت　　در آرم بفضل خودش در بہشت

وگر عار دارد عبادت پرست   کہ درخلد باوے بود ہم نشست
بگو ننگ از ودر قیامت مدار   کہ آں را بجنت برند ایں بنار
کہ آں راجگر خوں شداز سوز ودرد   گرایں تکیہ بر طاعت خویش کرد
نہ دانست در بارگاہ غنی   کہ بے چارگی بہ زکبر ومنی

ترجمہ: وہ اسی میں لگا تھا کہ بڑی صفتوں والے کی طرف سے وحی آئی عیسی علیہ السلام پر کہ خواہ وہ عالم ہے یا جاہل، میرے یہاں دونوں کی دعا مقبول ہے۔ اس کے برے کام میں نے معاف کردئے، میں اس کو اپنی مہربانی سے جنت میں لیجاؤنگا۔ اگر عبادت پرست کو عار ہے کہ وہ جنت میں اس کے ساتھ رہے، تو اس کو بتا دو کہ قیامت میں اس سے ذلت محسوس نہ کرے اس لئے کہ اس کو جنت میں اور اس کو جہنم میں لے جائینگے، اس لئے کہ سوز اور درد سے اس کا جگر خون ہوگیا اگر اس نے اپنی عبادت میں گھمنڈ کیا ہے۔ اس کو یہ معلوم نہیں ہے کہ بے نیاز کے دربار میں عاجزیٔ تکبر اور خودی سے بہت بہتر ہے۔

یعنی وہ اپنے غرور ہی میں مست تھا کہ حق تعالیٰ کی جانب سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر وحی آگئی کہ اگر یہ عالم ہے تو کیا اور وہ جاہل ہے تو کیا میں نے دونوں کی دعا قبول کرلی۔ وہ دعا یہ تھی ۔

گناہم بہ بخش اے جہاں آفریں   کہ گر بامن آید فبئس القرین

یعنی اے پروردگار! میرے گناہ بخش دے، کیونکہ قیامت میں اگر وہ میرے ساتھ رہا تو نہایت ہی برا ساتھی ہوگا۔

اس گنہگار سے تو اسکے برے اعمال کو معاف کردیا اور محض اپنے فضل وکرم

سے جنت میں داخل کردیا اور فرمایا کہ ان عابد صاحب کو اگر اس بات سے عار ہے کہ اس کے ساتھ جنت میں رہیں تو ان سے کہہ دو کہ قیامت میں عار کا بالکل اندیشہ نہ کریں، اس کو جنت میں لیجائیں گے اور تم کو جہنم میں، اسلئے کہ اس غریب کا دل تو پارہ پارہ اور جگر بالکل خون ہوگیا ہے، اور انھوں نے اپنی طاعت پر تکیہ کیا تھا، کیا یہ اتنی بات بھی نہیں جانتے کہ غنی کے دربار میں بیچارگی ہی بھلی ہے کبر اور انانیت سے ۔

کرا جامہ پاک است وسیرت پلید   در دوزخش را نباید کلید
بریں آستاں عجز ومسکینیت   بہ از طاعت وخویشتن بینیت
چوں خود را ز نیکاں شمردی بدی   نمی گنجد اندر خدائی خودی
اگر مردی از مردیٔ خود مگوی   نہ ہر شہ سوارے بدر بردہ گوی
پیاز آمد آں بے ہنر جملہ پوست   کہ پنداشت چوں پستہ مغزے دروست
دریں نوع طاعت نیاید بکار   برو عذر تقصیر طاعت بیار
نخورد از عبادت برآں بے خرد   کہ باحق نکو بود باخلق بد

یعنی جس شخص کا ظاہر اچھا ہے اور باطن خراب اس کے لئے دوزخ کے دروازے پہلے سے کھلے ہیں۔ دوزخ اس کے انتظار میں ہے۔ (لہٰذا) دوزخ کا دروازہ کھولنے کے لئے کنجی کی حاجت نہیں ہے۔ اس درگاہ میں تو عاجزی اور مسکنت بہتر ہے کہ طاعت اور خود بینی سے۔ کیونکہ تو نے اگر اپنے کو پارسا گمان کیا تو نہایت برا ہے اس لئے کہ خدائی کے اندر خودی کا گذر نہیں۔ اگر تم عقلمند ہو تو اپنی بڑائی مت ہانکو اس لئے کہ ہر شہسوار کے لئے یہ ضروری نہیں ہے

کہ وہ جولانگاہ میں گیند آگے لیجائے۔ جو شخص اپنے متعلق یہ خیال کرے کہ وہ مانند پستہ کے مغز ہی مغز ہے تو جان لو کہ وہ کچھ بھی نہیں۔ ایسا شخص مہمل ہے اور مانند پیاز کے تہ بتہ چھلکا ہی چھلکا ہے۔ اس قسم کی عبادت (جس کے بعد عجب پیدا ہو جائے) کچھ کام نہیں آتی بلکہ دراصل طاعت کر کے اپنی تقصیر کی معذرت کرنی چاہئے (تاکہ کام آئے) دیکھو وہ عابد اسی حقیقت سے بے خبر تھا اس لئے اپنی عبادت کے ثمرات نہ پاسکا کیونکہ حق تعالیٰ کے ساتھ اس کا معاملہ درست تھا (کہ عابد تھا) مگر مخلوق کے ساتھ برا تھا (کہ کبر میں مبتلا تھا)

آگے شیخ بطور تنبیہ کے فرماتے ہیں ۔

سخن ماند از عاقلاں یادگار　　زسعدی ہمیں یک سخن یاد دار
گنہ گار اندیشناک از خدائے　　بہ پارسائے عبادت نمائے

یعنی قاعدہ ہے کہ عاقلوں کی باتیں یاد رکھی جاتی ہیں لہٰذا تم بھی سعدیؔ یہی ایک بات یاد رکھ لو کہ جس گنہگار کو خوف الٰہی ہو اور وہ اپنے معاصی کی وجہ سے لرزاں اور ترساں ہو اور مغفرت کے باب میں صرف اللہ پر اس کی نظر ہو وہ اس پارسا سے بہتر ہے جو اپنی عبادت میں ریا کرتا ہو۔

میں نے یہ پورا واقعہ جو آپ کو سنایا تو مقصد اس سے یہی اس کا آخری شعر تھا کہ ۔

گنہگار اندیشناک از خدائے　　بہ از پارسائے عبادت نمائے

یعنی اللہ تعالیٰ سے اندیشہ کرنے والا گنہگار بہتر ہے اس پارسا سے جو عبادت کو دکھانے کے لئے کرتا ہے۔

اس واقعہ کا ثمرہ و فائدہ

اس کے متعلق کچھ تفصیل سے کہنا چاہتا ہوں سنئے:۔

شیخ سعدیؒ مقابلہ فرماتے ہیں کہ یہ عبادت پرست ایسا ہے کہ سلوک کو اس سے زیادہ اس گنہگار نے سمجھا کیونکہ عبادت سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ انسان کو حق تعالیٰ کی معرفت ہو اور معصیت کا یہ خاصہ ہے کہ وہ حق تعالیٰ سے دور کر دیتی ہے۔ چونکہ اس پارسا کی عبادت ریائی تھی اور اس نے اس کے اندر کبر شامل کر لیا تھا اس لئے یہ عبادت بھی اللہ سے بُعد کا ذریعہ بن گئی۔ اور اس گنہگار نے چونکہ حق تعالیٰ کا خوف اختیار کیا اور خدا کی پکڑ سے ڈرا اپنے گناہوں پر نادم ہوا اور حق تعالیٰ کے سامنے رویا۔ ان سب آثار نے اس کو حق تعالیٰ سے قریب کر دیا۔ عبادت کرنے کے بعد اگر عبادت پر نظر ہو اور خود پسندی پیدا ہو تو سمجھنا چاہئے کہ یہ شخص عبادت پرست ہے خدا پرست نہیں۔ عابد پارسا نہیں ہے بلکہ ناپارسا ہے اور ان صفات میں اولاد آدم میں سے ہونے کے باوجود ابلیس کا متبع ہے۔ کیونکہ طاعت میں ریا اور کبر ابلیس کی صفت ہے۔ اول بانی ریا اور کبر کا ابلیس ہے اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام میں سب سے بڑی صفت عاجزی و تواضع اور خلوص ہوتی ہے۔ اب عابدوں میں جو ریا و کبر ہوتا ہے تو وہ ابلیس کے اغوا و اضلال سے ہوتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ یہ دشوار گذار گھاٹی ہوتی ہے عابدوں کے لئے۔ اس سے مفر کی صورت نہیں بجز اس کے کہ انبیاء کی سچی پیروی ان کے اخلاق و عادات میں

ریاضت ومجاہدات کے ساتھ اختیار کیجائے یہی مطلب ہے اس شعر کا۔

مپندار سعدی کہ راہ صفا ۔۔۔ تواں رفت جز بر پئے مصطفیٰ
خلاف پیمبر کسے رہ گزید ۔۔۔ کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

اور ابلیس چونکہ اپنے ریا اور کبر اور حسد کی بناء پر مردود بارگاہ ایزدی ہوا تھا اس لئے اولاد آدم کو اغواء کرتا ہے اور ان میں یہ صفات پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور یہ جو میں نے کہا کہ ریا اور کبر کا بانی ابلیس ہے تو اسکے متعلق سنئے۔

تکبر کے بارے میں تو نص ہی ہے کہ اَبیٰ وَاسْتَکْبَرَ وَکَانَ مِنَ الْکَافِرِیْنَ (سورہ بقرہ:۳۴) ''اس نے کہنا نہ مانا اور غرور میں آ گیا اور کافروں میں سے ہو گیا''۔

اور ریا کے بارے میں سنئے

اس آیت کی حضرت شیخ الہند کی تفسیر

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کے تحت فرماتے ہیں کہ جنات چند ہزار سال سے زمین میں متصرف تھے۔ اور آسمان پر بھی جاتے تھے، جب ان کا فساد اور خوں ریزی بڑھی تو ملائکہ نے بحکم الٰہی بعض کو قتل کیا اور بعض کو جنگل پہاڑ اور جزائر میں منتشر کر دیا۔ ابلیس ان میں بڑا عالم اور عابد تھا اس نے جنات کے فساد سے اپنی بے لوثی ظاہر کی فرشتوں کی صفائی سے یہ بچ گیا اور انھیں میں رہنے لگا۔ اور اس طمع میں کہ تمام جنات کی جگہ اب صرف میں تمام روئے زمین پر متصرف بنایا جاؤں عبادت میں بہت کوشش کرتا رہا اور

خلافت ارضی کا خیال پکاتا رہا۔ جب حکم الٰہی حضرت آدمؑ کی نسبت خلافت کا ظاہر ہوا تو ابلیس مایوس ہوا اور اپنی عبادت ریائی کے رائیگاں جانے پر جوش حسد میں سب کچھ کیا اور ملعون ہوا۔ (حاشیہ شیخ الہند ص ۸)

مولانا رومؒ کی اس واقعہ کے متعلق تحقیق

اسی واقعہ کو مولانا رومؒ فرماتے ہیں۔

صد ہزاراں سال ابلیس لعیں ۔۔۔ بود ز ابدال وامیر المؤمنین
پنجہ زد با آدمی نازے کہ داشت ۔۔۔ گشت رسوا ہم چو سرگیں وقت چاشت
پنجہ با مرداں مزن اے بوالہوس ۔۔۔ برتر از سلطاں چہ می رانی ترس

یعنی لاکھوں سال ابلیس لعین بزرگ اور افضل اہل ایماں رہا، حتیٰ کہ ناز وعجب میں آ کر حضرت آدم علیہ السلام کا مخالف اور مقابل بن بیٹھا۔ اور ایسا رسوا ہوا جیسے تیز دھوپ کے وقت گوبر۔ واقعی مردان خدا کا مقابلہ ودعویٰ مساوات کبھی نہ کرنا۔ بھلا بادشاہ سے آگے گھوڑا اچلانا کیا زیبا ہے؟

اسی طرح یہ حضرات بوجہ قرب وقبول مثل بادشاہ کے ہیں۔ ان سے سبقت کا دعویٰ خسران محض ہے۔

اسی طرح حسد کا بانی بھی ابلیس ہے مولانا روم فرماتے ہیں۔

در حسد گیرد ترا در رہ گلو ۔۔۔ در حسد ابلیس را باشد غلو
کوز آدم ننگ دارد از حسد ۔۔۔ باسعادت جنگ دارد از حسد
عقبۂ زیں صعب تر در راہ نیست ۔۔۔ اے خنک آنکس حسد ہمراہ نیست

یعنی اگر راہ حق میں حسد تیرا گلوگیر ہو جائے تو سمجھ لے کہ حسد طریقہ ابلیس کا ہے۔ اور وہ اس صفت میں کمال رکھتا ہے کہ اس کو آدم علیہ السلام سے بوجہ حسد ہی کے عار ہوا تھا اور واقع میں اس حسد کی بدولت اپنی ہی منفعت اور سعادت سے مخالفت کرتا تھا۔ اس راہ سلوک میں بھی حسد سے بڑھ کر کوئی امر مانع نہیں کہ اس کے سبب سے ناقصین کمال حاصل کرنے سے رہ گئے۔ کامل کا اتباع کرنے کو خلاف شان سمجھا، بالخصوص اپنے شیخ کے خلیفہ سے کہ وہ اپنا پیر بھائی ہوتا ہے رجوع کرنا تو غالب طبائع کے خلاف ہوتا ہے اور یہ خیال ہوتا ہے کہ ہم بوجہ پیر بھائی ہونے کے مساوات کا مرتبہ رکھتے ہیں پھر اس سے کس طرح التجا کریں اور تکمیل بدون کسی کامل کی اتباع کے ممکن نہیں وہ بڑا خوش حال ہے جس کے پاس حسد نہیں ہے۔

دیکھئے! جس طرح یہاں شیطان کو آدم علیہ السلام سے عار ہوا وہی عار اس عبادت پرست کو بھی گنہگار سے ہوا تھا، اس لئے میں نے کہا کہ یہ شخص اپنی ان تمام صفات میں ابلیس کا پیرو ہے، اور وہ گنہگار حضرت آدم علیہ السلام کے نقش قدم پر چلا، کیونکہ خطا آدم علیہ السلام سے بھی ہوئی تھی، مگر انھوں نے اس کے بعد کس قدر ندامت اور شرمساری کا ثبوت دیا۔

ابلیس کا واقعہ روح المعانی سے

صاحب روح المعانی نے بھی ابلیس کے قصہ کی تفسیر کرتے ہوئے نہایت عمدہ اور خوب کلام فرمایا ہے، جی چاہتا ہے کہ اس موقع پر اس کو بھی بیان

کردوں۔ فرماتے ہیں کہ:۔

ثم الظاهر ان كفره عن جهل بان استرد سبحانه تعالیٰ منه ماعاد من العلم الذی كان مرتديابه حين كان طاؤس الملٰئكة واظافير القضاء اذاحكت ادمت وقسی القدر اذارمت اصمت ؎

وكان سراج الوصل ازهر بيننا
فهبت به الريح من البين فانطفى

ظاہر تو یہی ہے کہ ابلیس کا منشاء اس کا جہل ہوا، جس کی صورت یہ ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ علم اس کو مرحمت فرمایا تھا، جسے وہ چادر بنائے ہوئے تھا، جب کہ فرشتوں کے درمیان طاؤس بنکر رہتا تھا۔ وہ علم اس سے سلب فرمالیا، اور قضا کے ناخن جب گڑائے جاتے ہیں تو زخمی بنا دیتے ہیں، اور قدر کی کمان جب تیراندازی کرتی ہے تو بہرا بنا دیتی ہے۔ شیطان زبان حال سے کہتا تھا کہ وصل کا چراغ ہمارے اور ہمارے محبوب کے درمیان روشن تھا کہ اچانک فراق کی ہوا چلی اور وہ بجھ گیا۔

وقيل عناد حمله عليه حب الرياسة والاعجاب بمااوتی من النفاسة ولم يدرالمسكين انه لو امتثل ارتفع قدره وسما بين الملاء الاعلیٰ فخره

ایک قول یہ ہے کہ اس کے کفر کا سبب اس کا عناد بنا تھا، جس پر حب جاہ اور جس شرف سے مشرف تھا اس پر اعجاب نے اس کو ابھارا تھا، اور مسکین نے یہ بھی نہ جانا کہ اگر اللہ تعالیٰ کے حکم کا امتثال کر لیتا تو اس کی قدر اور بڑھ جاتی اور عالی مرتبہ ملائکہ

ولكن ۔
اذالم يكن عونامن الله للفتىٰ
فاول مايجنى عليه اجتهاده

میں اس کا شہرہ اور بلند ہو جاتا، لیکن بات یہ ہے کہ جب کسی شخص کے شامل حال اللہ تعالیٰ کی مدد نہیں ہوتی تو اول وہ چیز جو اسکو نقصان پہونچاتی ہے وہ خود اسکا اجتہاد ہوتا ہے (یعنی اسکی فہم ماری جاتی ہے)

آگے فرماتے ہیں کہ:۔

وكم ارقت هٰذه القصة جفونا وارقت من العيون عيونافان ابليس كان مدة فى دلال طاعتــه يختال فى رداء مرافقه ثم صار الىٰ ما ترىٰ واجرى مابه القلم جرى ۔
وكنا وليلى فى صعودمن الهوىٰ فلما توافيننا ثبت و زلت
(روح المعانى ص ۳۱۲ ج۱)

اس واقعہ نے نہ جانے کتنی آنکھوں سے ہمیشہ ہمیش کیلئے نیند ہی کواڑادیا، اوران کیلئے پلک جھپکانے کوحرام کردیا، اورنہ معلوم کتنی چشم ہیں جنھوں نے اس قصہ کوسنکر چشمے جاری کردئے اس لئے کہ شیطان ایک زمانہ تک اپنی طاعت کے غرور وناز میں تھا، اورحق تعالیٰ کےتعلق کی چادر میں اتراتا پھرتا تھا، لیکن اس کے بعد اس کا جو حشر ہوا وہ تم کومعلوم ہی ہے۔تقدیر کا لکھا سامنے آیا اوروہ اس کا مصداق ہوا کہ ہم اور لیلی عشق ومحبت کے پہاڑ پر چڑھے چلے جارہے تھے، پس جس وقت کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے ملے ہی تھے کہ میں تو ثابت رہااوروہ پھسل گئی۔

ابلیس کا یہ واقعہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے، یہی سب سے پہلا قصہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں بیان فرمایا ہے اس لئے اس میں بڑی ہدایت رکھی ہے اور اللہ تعالیٰ کے بہت سے بندوں نے اس قصہ سے ہدایت حاصل کی ہے۔جیسا کہ صاحب روح المعانی نے لکھا ہے کہ نہ معلوم کتنی آنکھوں سے اس واقعہ نے نیند کو اڑا دیا اور نہ معلوم کتنی آنکھوں نے اس کی وجہ سے آنسوؤں کے دریا بہا دیئے۔لیکن یہ سب اسی وقت تھا جب قرآن شریف کو سمجھ کر پڑھایا جاتا تھا۔اب ہم لوگ بھی ان آیات پر سے گذرتے ہیں مگر ذرا قلب میں حرکت نہیں پیدا ہوتی حالانکہ کبر وعجب جیسے رذائل کو بیخ وبن سے اکھاڑ پھینکنے کیلئے یہی ایک واقعہ کافی ہے کہ ابلیس عجب وپندار میں مبتلا ہو کر ہلاک ہوگیا اور حضرت سیدنا آدم علیہ السلام نے توبہ وانابت کی تو قصور معاف ہوگیا اور مقبول ومحبوب ہوگئے۔

حضرت مولانا تھانویؒ کبھی کبھی ابلیس اور آدم کے اس واقعہ کے سلسلہ میں خاقانی کے کچھ اشعار پڑھا کرتے تھے جس سے لوگوں کو بڑا ہی لطف آتا تھا اور مجمع جھوم جاتا تھا حضرت یہ پڑھتے تھے کہ۔

ابلیس گفت طاعت من بیکرانہ بود — سیمرغ وصل رادل وجاں آشیانہ بود
آدم زخاک بودومن ازنور پاک او — گفتم کہ من یگانہ واوخود یگانہ بود
درلوح بدنوشتہ کہ ملعوں شود یکے — بردم گماں بہ ہرکس وبرخود گماں نبود
اوخواست تا فسانہ لعنت کند مرا — کردانچہ خودا ست آدم خاکی بہانہ بود
خاقانیا تو تکیہ بر طاعات خود مکن — کیں پند بہر دانش اہل زمانہ بود

یعنی ابلیس نے کہا کہ میری طاعات کثیر تھیں اور اللہ تعالیٰ مجھ سے میرے دل وجان سے زیادہ قریب تھے۔ آدم تو مٹی سے بنائے گئے تھے اور میری تخلیق اللہ تعالیٰ کے نور سے ہوئی تھی اور میں اپنے ہی کو یگانہ سمجھتا تھا لیکن واقعہ یہ تھا کہ حضرت آدم علیہ السلام ہی یگانہ اور مقرب تھے یا یہ مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ یگانہ تھے اپنی توحید میں اور افسوس کہ لوح محفوظ میں یہ لکھا ہوا تھا کہ ایک ذات ملعون ہوگی، میں نے ہر ایک کو اس کا مصداق گمان کیا مگر اپنی طرف خیال نہیں گیا، اللہ تعالیٰ کو یہی منظور تھا کہ مجھے لعنت کا فسانہ بنا دیں۔ چنانچہ بنا دیا باقی آدم خاکی کا واقعہ تو بس ایک بہانہ ہی تھا۔ اے خاقانی خبردار! تم اپنی طاعت پر کبھی تکیہ نہ کرنا کیونکہ ابلیس کا یہ واقعہ اہل دنیا کی عبرت ہی کے لئے معرض وجود میں آیا ہے۔

دیکھئے: اس سے بھی معلوم ہوا کہ طاعات پر تکیہ کرنا اور اس پر نظر کرنا یہ صفت ابلیس کی تھی جیسا کہ یہاں اس عابد ناپارسا نے کیا اور اپنے کو پارسا سمجھا۔ اور دوسرے کو بہ نظرِ تحقیر دیکھنا یہ شیطان کی صفت بیان کی گئی ہے کہ وہ بھی یہی سمجھتا تھا کہ جو ذات ملعون ہوگی وہ میں نہیں ہوں بلکہ انسان اور فرشتوں میں ہی سے کوئی ہوگا، حالانکہ خود ہی ہونے والا تھا اور اپنے سے بے خوف تھا اور فرشتے جو کہ اس سے محفوظ تھے، ان میں سے ہر ہر فرد اپنے ہی متعلق یہ اندیشہ رکھتا تھا کہ کہیں وہ میں ہی نہ ہوں۔

عابد ریاکار کو مؤاخذۂ اخروی کا خوف نہ تھا

بالکل یہی حال یہاں اس عابد ناپارسا اور گنہگار اندیشہ ناک کا تھا کہ عابد

کو گرفت کا مطلق خوف نہ تھا بلکہ وہ اس کی جانب سے مطمئن تھا اور گنہگار کو مواخذۂ خداوندی کا خوف تھا۔ شیخ سعدی علیہ الرحمہ نے اس واقعہ کو بیان کر کے عابدین کا ناز ہی ختم کر دیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ واقعی مربی ہیں کیونکہ بزرگوں کا یہی کام ہے کہ وہ لوگوں کی تربیت کریں اور جس جانب سے گمراہی کو آتا دیکھیں اس پر تنبیہ کریں۔

یہاں ایک اور بات یہ سمجھ لیجئے کہ شیخ سعدیؒ عاصی جری اور بیباک کا حکم نہیں بیان فرما رہے ہیں۔ چنانچہ گنہگار کی صفت یہاں اندیشناک بیان کی ہے اس سے معلوم ہوا کہ جس گنہگار کو اپنے گناہوں پر اندیشہ نہ ہو اس کا دوسرا حکم ہے۔ جیسا کہ ایک شخص کا واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ مرتے وقت اس نے اپنے محبوب مجازی کو مخاطب کر کے یہ کہا کہ اے محبوب تیری رضا معبود جلیل کی رضا سے مقدم ہے۔ توبہ توبہ یہ تو صریح کفر ہے۔

اسی طرح سے ایک شخص مرتے وقت یہی کہہ رہا تھا کہ یہ کپڑا چار روپیہ گز اور یہ کپڑا تین روپیہ گز ہے۔ انا للہ۔ تو اس کا ذکر نہیں بلکہ گفتگو اندیشہ کرنے والے گنہگار کی ہے۔ کیونکہ جب اس کو اندیشہ ہے تو خوف ہے اور جب خوف ہے تو ایمان ہے اور جب ایمان ہے تو نجات بھی ہے۔ تو اس کی یہ نجات در اصل اس کے ایمان کی وجہ سے ہوئی۔ اور عابد ناپارسا کے ایمان ہی میں کسر تھی، جبھی تو وہ ریاکار اور منکر ہوا۔ چونکہ اس نے عبادت مخلوق کے دکھانے کے لئے کی تھی اس لئے اللہ تعالیٰ کی معرفت کا ذرا سا بھی حصہ اس کو نہیں ملا۔ کیونکہ اگر معرفت ہوتی تو اس قسم کی ڈینگ سے اس کو باز رکھتی۔ اہل

معرفت کے پیش نظر تو حق تعالیٰ کا یہ ارشاد ہوتا ہے **فَسَیَعۡلَمُ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡۤا اَیَّ مُنۡقَلَبٍ یَّنۡقَلِبُوۡنَ** (سورہ الشعراء:۲۲۷) ''یعنی ظالمین کو عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ کیسی جگہ ان کو لوٹ کر جانا ہے''۔

بزرگان دین پر یہ آیت نہایت سخت ہے۔ اس کی وجہ سے ان کا پتہ پانی ہو گیا ہے۔ اگر اس عابد کو طاعت سے کچھ بھی فیض ہوا ہوتا تو ایسی بات زبان سے نہ نکالتا کہ اس کو بد بخت کہا اور یہ کہہ دیا کہ ع

خدایا تو با او مکن حشر من

اے اللہ میرا حشر روز قیامت اس کے ساتھ نہ کرنا۔

تو دیکھئے شیخ کے بیان سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ مطلق گنہگار کو مطلق عابد سے نہیں بڑھا رہے ہیں، بلکہ یہاں وہ گنہگار مراد ہے جس نے خدا کا خوف کیا، تواضع اختیار کی، اپنے گناہوں پر نادم اور شرمسار ہوا، آخرت کا یقین کیا، اور نہایت ہی خلوص کے ساتھ حق تعالیٰ سے دعا کی جو قبول ہو گئی، اس لئے اس کی مغفرت ہو گئی۔ اور عابد سے وہ عابد مراد ہے جس نے ریا اور تکبر اختیار کیا اور عبادت نے اس کے نفس میں ذرا بھی تواضع اور جھکاؤ نہیں پیدا کیا تو ایسے گنہگار کو ایسے عابد پر شیخ بڑھا رہے ہیں ورنہ یہ تو معلوم ہی ہے کہ ''**کفر دون کفر**'' کفر کفر میں تفاوت ہوتا ہے۔ اور ''**معصیة دون معصیة**،، ہوتی ہے۔ یعنی گناہ گناہ میں فرق ہوتا ہے۔ چنانچہ بعضے گناہ ایسے ہیں کہ ان کا انجام جہنم ہی ہے۔ شیخ اس کی فضیلت نہیں بیان کر رہے ہیں کیونکہ یہ نص کے بھی خلاف ہے۔

یہ آیت عابدین کو رلانے والی ہے

حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ **اَمۡ حَسِبَ الَّذِیۡنَ اجۡتَرَحُوا السَّیِّاٰتِ اَنۡ نَّجۡعَلَهُمۡ کَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحۡیَاهُمۡ وَمَمَاتُهُمۡ سَآءَ مَا یَحۡکُمُوۡنَ** (سورہ جاثیہ:۲۱) ''یہ لوگ جو برے برے کام کرتے ہیں کیا یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم ان کو ان لوگوں کی برابر رکھیں گے جنہوں نے ایمان اور عمل صالح اختیار کیا کہ ان سب کا جینا اور مرنا یکساں ہو جاوے یہ برا حکم لگاتے ہیں''۔

آیت سے تو معلوم ہوتا ہے کہ مؤمن وکافر اور اسی طرح سے مؤمن عاصی اور مؤمن طائع برابر نہیں یہ آیت کفار کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ جیسا کہ صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ کلبی سے روایت ہے کہ عتبہ وشیبہ وولید بن عتبہ ان سب نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت حمزہؓ اور دوسرے مؤمنین سے کہا کہ **واللہ ما انتم علی شئ ولئن کان ما تقولون حقاً لحالنا افضل من حالکم فی الآخرة کما هو افضل فی الدنیا فنزلت الآیة** ''**اَمۡ حَسِبَ الَّذِیۡنَ اجۡتَرَحُوا السَّیِّاٰتِ**'' **الایة**

یعنی عتبہ وشیبہ اور ولید نے حضرت علیؓ وحضرت حمزہؓ اور دوسرے مسلمانوں سے بر بنائے غایت کبر کے یہ کہا کہ تمہارا دین کچھ نہیں، آخرت وغیرہ کچھ نہیں اور اگر بالفرض تمہاری بات صحیح ہوئی یعنی مرنے کے بعد پھر زندگی ہو گئی تو آخرت میں بھی ہمارا حال تم لوگوں کے حال سے اچھا ہوگا۔

جیسا کہ آج دنیا میں ہے۔اس پر یہ آیت نازل ہوئی اس کے بعد صاحب
روح المعانی فرماتے ہیں کہ ”**یستنبط منھا تباین حالی المؤمن
العاصی والمؤمن الطائع** ،، فرماتے ہیں کہ یہ آیت اگرچہ کفار کے
بارے میں نازل ہوئی یعنی مؤمن اور کافر برابر نہیں تاہم اس سے مؤمن
عاصی اور مؤمن طائع کا حکم بھی معلوم کیا جا سکتا ہے۔یعنی یہ دونوں بھی برابر
نہیں ہو سکتے۔اور اس کے بعد فرماتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ بہت سے عباد کو
دیکھا گیا کہ اس آیت کی تلاوت کے وقت روتے تھے یہاں تک کہ اس آیت
کا نام ہی **مبکاۃ العابدین** (یعنی عابدین کو رلانے والی آیت) پڑ گیا۔

روایت میں ہے کہ حضرت تمیم داری نے سورۂ جاثیہ کی تلاوت کی،جب
اس آیت پر پہونچے تو اس کو دہراتے رہے اور روتے رہے یہاں تک کہ صبح
ہوگئی۔اور وہ مقام ابراہیم کے پاس نماز پڑھ رہے تھے۔اسی طرح سے بشیر جو
ربیع بن خثیم کے مولیٰ ہیں بیان کرتے ہیں کہ ربیع نماز پڑھ رہے تھے اور اس
آیت پر سے گذرے پس صبح تک اسی کو بار بار دہراتے رہے۔حضرت فضیل
ابن عیاض اپنے نفس کو مخاطب کر کے کہتے تھے جب اس آیت پر سے گذرتے
تھے کہ اے نفس کاش کہ تو یہ جان لیتا کہ ان دو فریقوں میں سے تو کس میں سے
ہے۔آیت میں علاوہ ایمان وکفر کے مقابلہ کے چونکہ یہ بھی احتمال ہے کہ
صالحین اور طالعین (غیر صالحین) کا باہم مقابلہ ہو،اسی لئے بزرگان دین اس
کی تلاوت کے وقت روتے تھے۔صاحب روح المعانی آگے فرماتے ہیں کہ
میں نے بہت سے مغرورین کو (جو کہ شب وروز فسق وفجور میں مبتلا رہتے

ہیں) زبان قال وزبان حال سے یہ کہتے سنا ہے کہ ہم قیامت کے دن بہت
سے عابدین سے اچھے ہی رہیں گے۔یہ ان کی صریح گمراہی اور نفس کا بھلاوا
ہے۔اس زمانہ میں بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے۔اب اس قسم کی آیات کو
تلاوت کر کے رونا اور اللہ تعالیٰ سے خوف کرنا یہ سب ختم ہو گیا۔بس یہ رہ گیا
ہے کہ جہاں کوئی عالم ہوا اور اس نے دین کا کچھ کام کرنا شروع کیا تو دیکھا
جاتا ہے کہ ہر محفل ہر ہوٹل میں اسی کی غیبت شکایت اور اسی کا برائی سے تذکرہ
رہتا ہے۔دراصل ابلیس ایسے لوگوں کی طرف سے سوءظن پیدا کرا دیتا ہے
تا کہ لوگ دین ہی نہ سیکھ سکیں اور اس میں اپنا معین بہت سے شیاطین الانس
کو بنا لیتا ہے جو ایمان کے حق میں رہزن ہوتے ہیں۔اب ان چوروں اور
ڈاکوؤں کو کوئی کہنے والا نہیں یہ باتیں میں غلط نہیں کہہ رہا ہوں۔مگر کسی سے
آپ سنئے گا بھی نہیں کس قدر ستم کی بات ہے کہ عابدین تو اسکی وجہ سے رو رہے
ہیں اور فاسقین کا کل وقت دینداروں کی برائی کرنے اور ان پر قہقہہ لگانے
میں صرف ہو رہا ہے۔

آگے حق تعالیٰ فرماتے ہیں یعنی ان دو جماعتوں کو جو لوگ برابر سمجھ رہے
ہیں تو یہ فیصلہ ان کا صحیح نہیں عاصی اور طائع دونوں کیسے برابر ہو سکتے ہیں۔اللہ
تعالیٰ نے یہ فرما کر نیک لوگوں کا آنسو پوچھا ہے ورنہ تو یہ فاسق لوگ عابدین کو
اڑا ہی دیتے۔بیشک اللہ تعالیٰ ہی اپنی قوت سے ان کو دنیا میں رکھتے ہیں ورنہ تو
دوسرے قسم کے لوگ ان حضرات کے اکھاڑنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں
رکھتے۔نیک لوگوں کے لئے دنیا میں بڑی مشکلات ہیں،کمبخت کافر تو توہین

کرتے ہی ہیں، فاسق لوگ بھی انہیں کی راہ چلنے لگتے ہیں۔اس آیت میں نہایت ہی تعزیت اور تسلی ہے اللہ والوں کے لئے، چنانچہ حق تعالیٰ کی اسی عنایت کے تصور سے ان حضرات کو مزہ آجاتا ہے اور رات رات بھر اسی کی لذت میں گذار دیتے تھے، غرض ان مغرورین کا اپنے کو صالحین سے بہتر بتلانا نص کے بالکل خلاف ہے مگر یہ لوگ نص کو کیا جانیں ان کی نص تو ان کا نفس ہے۔اللہ تعالیٰ تو ارشاد فرماتے ہیں کہ دونوں برابر نہ ہوں گے۔اب اگر یہاں لوگ اپنے فسق وفجور کی وجہ سے صالحین پر غالب نظر آئیں اور قیامت میں بھی ان مجرمین ہی کا حال افضل ہو تو پھر قیامت کا کوئی معنی اور مقصد باقی نہ رہ جائیگا۔

اہل طاعت اور اہل معصیت برابر نہیں

دیکھئے: جب یہ امر منصوص ہے کہ اہل طاعت اور اہل معصیت یہ دونوں برابر نہیں تو ظاہر ہے کہ شیخ سعدیؒ بھی مطلقا گنہگار کو اہل طاعت پر کیسے فضیلت دے سکتے ہیں، شیخ نے یہاں جو عاصی اور عابد کا مقابلہ کیا اور عاصی کی تعریف کی تو یہ دوسری ہی بات تھی وہ یہ کہ یہاں معصیت کے ساتھ خوف بھی تھا جو کہ ایک قلبی عمل اور باطنی طاعت ہے اس کی وجہ سے اس کی نجات ہو گئی۔اور اس عابد میں عبادت کے ساتھ ساتھ کبر وناز پیدا ہو گیا تھا اس چیز نے اس کا بیڑا غرق کر دیا تو دراصل شیخ نے یہاں خوف وخشیت اور اللہ تعالیٰ کی رحمت پر نظر وغیرہ جیسی طاعات کی مدح فرمائی ہے اور عجب وکبر وریا جیسی

برائی کی مذمت کی ہے۔عابد کی عبادت بری نہ تھی مگر اس کا کبر یقیناً برا تھا کیونکہ اس کے متعلق حدیث شریف میں آتا ہے کہ ”**لایدخل الجنة من کان فی قلبه مثقال ذرة من کبر**،،(مشکوٰۃ شریف ص۴۴۵)

جنت میں وہ شخص داخل نہ ہوگا جس کے دل میں رائی برابر کبر ہوگا۔

(ظاہر ہے کہ کبر خواہ مال پر ہو یا علم پر ہو یا عبادت پر ہو سبھی برا ہے)

اور یہ ظاہر ہے کہ کبر دراصل شیطان کی صفت ہے وہ بھی بہت بڑا عبادت گذار تھا لیکن اپنے رذیلہ وکبر کی وجہ سے حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے جھکنے سے انکار کیا جس کی وجہ سے ذلیل ورسوا ہو گیا۔

بلعم باعورا کا واقعہ

مولانا رومؒ نے مثنوی میں اسی کبر وغرور کی وجہ سے تباہی کا ایک اور واقعہ بیان کیا ہے اور وہ قصہ ہے بلعم باعورا کا جو کہ بہت ہی عابد اور زاہد شخص تھا، مستجاب الدعوات بھی تھا مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مخالف ہو گیا اور ان کے ساتھ مقابلہ کر بیٹھا۔نتیجہ یہ ہوا کہ بزرگی تو کیا باقی رہتی ایمان بھی سلب ہو گیا۔

مولانا رومؒ فرماتے ہیں ؎

بلعم باعورا را خلق جہاں　　سفیہ شد مانند عیسیٰ زماں

سجدہ ناوردند کس را دون او　　صحت رنجور بود افسون او

پنجہ زد باموسیٰ از کبر وکمال　　آں چناں شد کہ شنیدستی تو حال

دیکھو بلعم باعورا کے تمام لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح فریفتہ اور

معتقد تھے اوراس کی سی تعظیم کسی کی نہ کرتے تھے اور بیماراس کی جھاڑ پھونک
سے صحت پاتے تھے لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جب مخالفت کی تو
وہ حال ہوا جو تم نے کسی عالم سے سنا ہوگا (کہ ایمان بھی سلب ہوگیا اور ظاہراً
بھی ذلیل وخوار ہوگیا) پس مخالفت اہل اللہ کی ایسی وبال کی چیز ہے۔آگے
فرماتے ہیں کہ اس مخالفت پر کچھ ایک ہی دو کو سزا نہیں ہوئی بلکہ

صد ہزار ابلیس وبلعم در جہاں　　　ہم چنیں بودست پیدا ونہاں
ایں دو را مشہور گردانید اللہ　　　تا کہ باشد ایں دو بر باقی گواہ
رہزناں را در بیاباں چوں کشند　　　یک دو تن را سوے دہ ذیشاں کشند
تا بہ بینند اہل دہ گیرند پند　　　رویت ایشاں بود شاں ہمچو پند

یعنی لاکھوں ابلیس اور بلعم کی مثل دنیا میں ہو چکے ہیں کچھ مشہور اور کچھ
غیر مشہور جن میں سے ان دو کو اللہ تعالیٰ نے زیادہ مشہور کر دیا تا کہ بقیہ امثال
بطور نظیر کے ہو جاویں جیسا کہ ناظمان سلطنت کا قاعدہ ہے کہ جب رہزنوں کو
جنگل میں قتل کرتے ہیں تو ایک دو کی لاش کو بستی میں لاتے ہیں تا کہ بستی والے
ان کو دیکھیں اور عبرت حاصل کریں اور ان کو دیکھنا ایسے افعال سے بندش کے
طور پر ہو جاوے۔

ایں دو را پرچم بکوئے شہر بود　　　کشتگان قہر را نتواں شمرد
نازنینی تو ولے در حد خویش　　　اللہ اللہ پا منہ زاندازہ بیش
گر زنی بر نازنیں تر از خودت　　　در تگ ہفتم زمیں زیر آردت

یعنی عالم میں ایسے چور بہت ہوئے ہیں صرف ان دو کا پرچم شہر میں لے

آئے ورنہ کشتگان قہر کا شمار نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ حضرت مولانا رومؒ نے ہی ایک
دوسرے مقام پر فرمایا کہ طریق میں پشتوں کے پشتے لگے ہوئے ہیں کوئی
یہاں گر پڑا کوئی کچھ دور آگے چل کر، غرض یہ راستہ کشتگان قہر سے پٹا پڑا
ہے۔آگے بطور نصیحت کے فرماتے ہیں کہ ہم نے مانا کہ تم بھی ناز والے ہو اور
بوجہ طاعت وتقویٰ کے محبوب ہو لیکن اپنے اندازہ پر یعنی ان کے درجہ پر نہیں
ہو۔ لہٰذا خدارا اپنی حد سے قدم آگے مت رکھنا، اور ان کا مقابلہ مت کرنا، اور
اگر تم ایسے شخص پر جو تم سے زیادہ مقبول ومحبوب ہے حملہ کرو گے تو تم کو قعر
زمیں ہفتم کے نیچے پہونچا دیگا۔ (کلید مثنوی ص۲۰۶ جلد اول حصہ دوم)

بہر حال وہ گنہگار اپنی تواضع اور کسر وانکسار کی وجہ سے کامیاب ہوگیا اور
وہ عابد اپنے عجب واستکبار کی وجہ سے ناکام رہا۔ علماء نے فرمایا ہے کہ تمام
اخلاق کی اصل تواضع ہے۔ تواضع جب انسان میں آجاتی ہے تو اس کے ساتھ
اور دوسرے اخلاق بھی درست ہو جاتے ہیں اور سارے رذائل کی جڑ تکبر
ہے۔ تکبر جب کسی میں پیدا ہو جاتا ہے تو اس کے ساتھ دوسرے اخلاق بھی
خراب ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح بزرگوں نے یہ بھی فرمایا ہے کہ ابلیس کو
درحقیقت اللہ تعالیٰ سے محبت نہ تھی۔ محبت ہی کے نہ ہونے سے اس نے کبر کیا
اس لئے کہ محبت کے ساتھ کبر اور محبوب کے حکم سے سرتابی جمع نہیں ہوسکتی۔
حضرت حافظ فرماتے ہیں۔

خلل پذیر بود ہر بنا کہ می بینی　　　مگر بنائے محبت کہ خالی از خلل است

یعنی ہر بناء جو تم دیکھتے ہو اس میں خلل ونقصان آجاتا ہے مگر محبت کی بناء

خلل سے خالی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مولانا رومؒ نے مثنوی میں عشق ومحبت کا بیان بہت زیادہ کیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں کہ ۔

ہر کہ را جامہ زعشقے چاک شد — اوز حرص وعیب کلی پاک شد

اس میں یہ بیان فرمارہے ہیں کہ قطعِ تعلقاتِ ماسوااللہ اورزوالِ حرصِ دنیا کا ذریعہ عشق ومحبت ہے،اس کی بدولت آدمی حرص اور جمیع نقائص بلکہ تمام اخلاق ذمیمہ سے بالکل پاک ہوجاتا ہے۔

اخلاق ذمیمہ کا علاج

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اس کی شرح کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ اخلاق ذمیمہ کے دوعلاج ہیں۔ایک جزئی یعنی خاص وہ یہ کہ ہر ہر خُلق کا جدا جدا علاج کیا جاوے جیسا کہ احیاء العلوم وغیرہ میں لکھا ہے اس کو طریق سلوک کہتے ہیں۔دوسرا کلی یعنی عام وہ یہ کہ ذکر وشغل سے یا جس طرح شیخ کامل تجویز کرے۔حق سبحانہ وتعالیٰ کی محبت قلب میں پیدا کی جاوے جب اس کا غلبہ ہوگا اپنی ہستی وخودی مضمحل ہونا شروع ہوگی اور سب اخلاق ذمیمہ جوکہ اس خودی اور دعوی ہستی سے پیدا ہوتے ہیں زائل ہوجائیں گے،اس کو طریق جذب کہتے ہیں۔اور طریق اول گو بےخطر ہے مگر طویل ہے اور طریق ثانی گوخطرناک ہے مگر قریب ہے،اور ہر شیخ کا مذاق مختلف ہوتا ہے،مولانا پر چونکہ مذاق ثانی غالب ہے اس لئے اسکی تعلیم فرماتے ہیں اور اس کی طرف

رغبت دلاتے ہیں اور اس کی مدح کرتے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں کہ

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما — اے طبیب جملہ علتہائے ما

اے دوائے نخوت وناموس ما — اے تو افلاطون وجالینوس ما

یعنی اے عشق تو ایسا ہے کہ تیری بدولت خیالات درست ہوجاتے ہیں اور تجھ سے امراض کا علاج ہوجاتا ہے۔تجھ سے نخوت وناموس کا دفعیہ ہوتا ہے۔یعنی عار وننگ کے دفع کرنے میں بہ نسبت دوسرے اخلاق ذمیمہ کے اسے ایک خاص خصوصیت حاصل ہے کیونکہ عشق کے لئے ذلت لازم ہے،کہ ذلت وناموس ایک جگہ جمع نہیں ہوتے۔

میں کہتا ہوں کہ طریق جذب میں یہ جوفرمایا کہ ذکر وشغل کے ذریعہ حق تعالیٰ کی محبت پیدا کی جائے اور جب محبت پیدا ہوجائے گی تو وہ سارے اخلاق ذمیمہ کوقلب سے نکال پھینکے گی تو یہ عشق کامل کے اثر کا بیان ہے۔یعنی جب عشق ومحبت کا استیلاء قلب پر ہوجاتا ہے تو پھر وہ ماسوا کوقلب سے نکال پھینکتی ہے اور تمام چیزوں کوجلا کر رکھ دیتی ہے۔ورنہ تو عشق جب تک ناقص رہتا ہے خطرہ سے خالی نہیں ہوتا۔چنانچہ بزرگان دین اسی درجہ میں عشق کوخطرناک فرماتے ہیں مگر اس کی وجہ نہیں بیان فرماتے،غور کرنے سے سمجھ میں آیا کہ خطرناک اسی وجہ سے ہے کہ بہت سے خطرناک حالات سے عبور کرنا ہوتا ہے ایسے کہ غیر مبتلا کے لئے اس کا سمجھنا بھی دشوار ہے۔چنانچہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اس کی وجہ سے انسان میں عجب وپندار اور اہل کمال سے مساوات کا دعویٰ پیدا ہوجاتا ہے۔اس لئے کہ عشق کی وجہ سے ناقص پر جب اس کامخصوص سرور

اور حظ طاری ہوتا ہے تو اس حالت میں وہ اپنی حد پر قائم نہیں رہتا بلکہ یہ سمجھتا
ہے کہ اس راہ میں میں سب پر فوقیت لے گیا ہوں۔ چنانچہ ناقص کے لئے جیسے
یہ ضروری ہے کہ وہ مدعیٔ کمال ہوجاتا ہے یہ نہایت خطرناک حالت ہے اور غلط
اس لئے ہے کہ گو اس کو عشق ومحبت کی سرشاری حاصل ہے، اور اس کی وجہ سے
وہ اپنے طور پر یہ بھی سمجھ رہا ہے کہ مجھے کوئی دولت حاصل ہوگئی ہے، تو سمجھے مگر
اسے کیا حق پہونچتا ہے کہ وہ اہل کمال سے مساوات کا دعویٰ بھی کرنے لگ
جائے یا اپنے آپ کو سب سے اونچا دیکھے اس کو اپنی حد پر رہنا چاہئے۔

اسی کو مولانا رومؒ فرماتے ہیں ؎

نازنینی تو ولے در حد خویش   اللہ اللہ پامنہ زاندازہ بیش

یعنی اگر تم ناز و انداز والے ہو تو حد کے اندر رہو، اللہ اللہ اندازہ وحد سے
پیر کو باہر نہ نکالو۔

میں کہتا ہوں کہ اس خطرہ سے محفوظ رہنے کے لئے سالک کو چاہئے کہ حق
تعالیٰ کی محبت کے ساتھ ساتھ ذکر وشغل سے بھی محبت کرے۔ کیونکہ جب اس
سے تعلق ومحبت پیدا ہوجائے گی تو پھر راستہ بالکل آسان اور بے خطر ہوجائے
گا۔ اس لئے ذکر وشغل اور اعمال صالحہ اس طرح سے کرنا چاہئے کہ ان اعمال
سے محبت ہوجائے اور جب ان اعمال سے محبت ہوجائے گی تو پھر اللہ تعالیٰ
سے بھی محبت ہوجائیگی۔ کیونکہ جنھیں اللہ تعالیٰ سے محبت ہوتی ہے وہ لوگ کچھ
آسمان پر نہیں چلے جاتے بلکہ یہیں رہتے ہیں۔ مگر ان اعمال سے ان کو خاص
محبت اور تعلق ہوجاتا ہے۔ لہٰذا جب تک ان اعمال سے محبت نہ پیدا ہوجائے

حالت بے شک خطرناک ہے، کیونکہ اللہ کی محبت وہی خطرناک ہے جو اعمال
کے واسطہ سے نہیں ہے، اور جو محبت کہ اعمال کے واسطے سے ہوتی ہے اس
میں کچھ بھی خطرہ نہیں ہوتا۔ آج جو لوگ اللہ تک نہیں پہونچ رہے ہیں اعمال
کے ذریعہ سے تو اسی لئے کہ ان اعمال سے محبت نہیں ہے، اور جب ان اعمال
سے محبت نہیں ہوتی تو پھر اللہ تعالیٰ سے بھی نہیں ہو پاتی۔ یہ جو بات کہہ رہا
ہوں اس کو خوب سمجھئے۔ نہایت ہی کام کی بات کہہ رہا ہوں حق تعالیٰ سے براہ
راست محبت خطرناک ہے۔ اس کو اہل محبت سمجھتے ہیں مگر اعمال کے ذریعہ سے
جو محبت اور معرفت ہوتی ہے اس میں خطرہ نہیں رہتا۔

گنہگاروں کی دو قسمیں

بہر حال میں یہ بیان کر رہا تھا کہ گنہگار کی بھی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جو
اپنے گناہوں پر جری ہو اور ایک وہ جو جری نہ ہو۔ ابلیس اپنی معصیت پر جری
تھا اور چونکہ خود اپنی دولت کھو چکا تھا اس لئے دوسروں کو بہکانا اور ان میں کبر
وغرور پیدا کرنا اس کی عام عادت تھی۔ چنانچہ اس عابد کے اندر بھی اس نے
اپنی ہی صفات پیدا کر دی تھی جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک نہایت ہی مبغوض اور
ناپسندیدہ ہیں۔ عبادت اللہ کے یہاں بہت ہیں، فرشتے مستقل عبادت
کرتے رہتے ہیں، کثرت عبادت کو وہاں پوچھتا کون ہے۔ اسی لئے اللہ
تعالیٰ کے جو نیک بندے ہوتے ہیں وہ بہت کچھ کرنے کے بعد بھی نظر اس پر
سے ہٹائے رہتے ہیں۔ ایسے ہی شخص کو فقیر الی اللہ کہتے ہیں۔ اسی طرح یہ

حضرات دوسروں کے عیوب سے صرف نظر کئے رہتے ہیں۔ باقی یہ درجہ حاصل کرنا بہت مشکل ہے کہ آدمی کومحبت ومعرفت حاصل ہو جانے اور طاعت وعبادت کرنے کے بعداس پرتکیہ نہ ہو بلکہ توکل حق تعالیٰ کے فضل پر ہو یہ بہت مشکل کام ہے۔ایک غریب شخص اگراپنے آپ کو مالدار نہ سمجھے تو چنداں کمال نہیں لیکن مالدار ہوکرانسان اپنے آپ کوفقیر سمجھے بلاشبہ یہ بڑا مشکل ہے۔

تواضع وتوکل اصل کمالات ہیں

مشائخ نے فرمایا ہے کہ بزرگوں کے اندر دوصفات نہایت ہی عمدہ ہوتی ہیں اور وہی ان کے سارے کمالات کی اصل ہیں ایک تواضع اور دوسرے توکل۔چنانچہ یہی ہمیشہ سےصالحین کی سیرت رہی ہے ؎

تکیہ برتقویٰ ودانش درطریقت کافریست　　راہرو گرصد ہنر دارد توکل بایدش

یعنی اپنے تقویٰ ودانش پر اعتماد کرنا طریقت میں کفر کی بات ہے۔ سالک اگرسوہنر بھی رکھتا ہوتب بھی اس کواللہ پرتوکل ہی کرنا چاہئے۔

حضرت مولانا تھانویؒ حضرت حافظؒ کے اس شعرکواپنے وعظ میں لائے ہیں۔اگرحضرت کے وعظ میں صرف یہی شعر ہوتا تو بھی یہ کہا جاسکتا تھا کہ حضرت نے طریقت سے سب کچھ بیان فرمادیا،اس لئے کہ یہ پورے طریقت کا خلاصہ ہے۔

شیخ سعدیؒ نے بھی اسی تکیہ سے منع فرمایا ہے۔چنانچہ عابد ناپارسا کی

حکایت میں فرماتے ہیں ؎

کہ آنرا جگرخوں شدازسوز ودرد　　گرایں تکیہ برطاعت خویش کرد

یعنی عابد نے چونکہ اپنی طاعت پرتکیہ کیا تھااس لئے تباہ ہوااورگنہگار اپنے گناہوں کوسوچ سوچ کرنہایت نادم اورافسردہ تھااس لئے نجات پاگیا۔ایک شخص کے پاس طاعت نہیں ہےاس لئے اس پرتکیہ بھی نہیں ہے۔اورایک کے پاس طاعت ہےاوراس پرتکیہ ہے یہ شخص پہلے سے کہیں زیادہ برا ہے۔جس کا ظاہرخراب ہواور وہ دوزخ میں چلا جائے اس سے اتنا تعجب نہیں جتنا کہ اس شخص سے تعجب ہے کہ جس نے ساری عمراپنے ظاہرکواچھا رکھا ہو۔طاعت کی ہومگر وہی ذریعہ بن جائے اس کے دوزخ میں جانے کا۔اس سے معلوم ہوا کہ عابد کا اپنی طاعت پرنظر کرنا یہ نہایت ہی بری چیز ہےاور گنہگار کا اللہ تعالیٰ کے رحم وکرم پر بھروسہ کرنا نہایت ہی عمدہ خصلت ہے۔ بزرگان دین تو طاعت کرنے کے بعد بھی نظراپنی طاعت پرنہیں رکھتے بلکہ اللہ تعالیٰ کے فضل ہی پر رکھتے ہیں۔اسی کا نام توکل ہے۔اورتوکل جیسے رزق کے بارے میں ہوتا ہے ویسے ہی طاعت میں بھی ہوتا ہے،یعنی طاعت کا کام تو سب کردے مگر بھروسہ اللہ پر رکھے یعنی یہ سمجھے کہ ان کی مہربانی ہوگی تو بس بیڑا پار ہوجائے گا ورنہ ممکن ہے کہ اسی طاعت میں ہی پکڑ میں آجاؤں۔

آپ نے دیکھا کہ حضرت سعدیؒ،حضرت حافظؒ حضرت مولانا تھانویؒ رحمہم اللہ اور دوسرے مشائخ سب اس امر پرمتفق ہیں کہ انسان کوعبادت کے باب میں بھی توکل اختیار کرنا چاہئے،اسی کو میں یوں کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے

انسان کو عبادت کے لئے پیدا فرمایا ہے تو اب طاعت کا نہ کرنا تعطل ہے اور عبادت کر کے اس پر نظر کرنا یہ گویا تشبیہ ہے اور طاعت کر کے اللہ تعالیٰ پر نظر رکھنا یہ توحید ہے، اور آپ جانتے ہیں کہ بزرگان دین نے جو اس توکل کو اپنا شعار وطریقہ بنایا ہے یہ کہاں سے ماخوذ ہے، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ یہ ارشاد فرمایا کہ کوئی شخص اپنی عمل کی وجہ سے جنت میں نہ جائے گا۔ اس پر حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے عرض کیا کہ کیا آپ بھی نہیں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم؟ آپ نے فرمایا کہ ہاں میں بھی نہیں۔ مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ ہی کی رحمت مجھے ڈھانک لے۔ دیکھئے! جب سید الانبیاء اور امام الاولیاء صلی اللہ علیہ وسلم اپنے متعلق یہ فرما رہے ہیں کہ جنت میں اپنے عمل کی وجہ سے نہیں جائینگے تو پھر اس کے سننے کے بعد کسی ولی یا کسی صوفی کی کیا مجال تھی کہ وہ اپنی طاعت پر نظر کرتا۔ یہی حدیث ماخذ ہے حضرات صوفیہ کے اس عمل کا کہ وہ طاعت پر نظر کو جائز ہی قرار نہیں دیتے محض اللہ تعالیٰ کی رحمت پر توکل کرتے ہیں۔

چنانچہ حضرت ابراہیم ابن ادہم کا واقعہ ''ترصیع الجواہر المکیہ'' میں لکھا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ایک شب اپنے ورد سے سو گیا جس کی وجہ سے مجھے کچھ تکدر ہوا، اس لئے کہ اس وقت میں ان لوگوں میں سے تھا جن کی نظر اپنی طاعات پر ہوتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے یہ سزا دی گئی کہ چند فرائض نیند کی وجہ سے مجھ سے چھوٹ گئے، اور باطن میں یہ ندا کی گئی کہ اے ابراہیم میرے بندے ہو جاؤ راحت پا جاؤ گے یعنی جب ہم سلادیں

سو جاؤ، اور قیام کی توفیق دیدیں تو قیام کر لو۔ ان دونوں کے درمیان تم کو کسی چیز کا اختیار نہیں ہے۔ دیکھئے حضرت ابراہیم بن ادہمؒ کا شمار اکابر اولیاء اللہ میں ہوتا ہے، مگر اپنے متعلق ایک وقت وہ بھی فرماتے ہیں کہ میری نظر طاعت پر تھی گو ان کے اخلاص کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے ان کو اس سے نکال دیا تاہم اس سے یہ تو معلوم ہوا کہ طاعت کر کے طاعت پر نظر ہو جانا کچھ بعید نہیں انسان جب اخلاص اختیار کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے آگے اپنے کو ڈال دیتا ہے ان کی قدرت اور ان کے استغنا اور ان کی بے نیازی کو اپنے سامنے رکھتا ہے تب ہی اس عقبہ سے نکلتا ہے۔ بزرگوں نے اس سے نکالنے کے لئے کیسے کیسے مضامین بیان کئے ہیں اور لوگوں کو سمجھانے کی بڑی کوشش کی ہے۔ چنانچہ شیخ سعدیؒ جو اس فن کے امام ہیں بوستاں میں فرماتے ہیں ؎

زمغرور دنیا رہ دیں مجوی — خدا بینی از خویشتن بیں مجوی
گرت جاہ باید مکن چوں خساں — بہ چشم حقارت نگہ در کساں
گماں کے برد مردم ہوشمند — کہ در سرگراں نیست قدر بلند
ازیں نامور تر محلے مجوئے — کہ خوانند خلعت پسندیدہ خوئے

یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ سے غافل ہو اور دنیا کے دھوکہ میں پڑا ہو اس سے دین کی توقع نہ رکھو۔ جو خود بیں (اپنے اوپر نظر رکھنے والا) شخص ہے اس سے خدا بینی کی امید نہ کرو اگر تم مرتبہ چاہتے ہو تو کمینوں کی طرح لوگوں کو بہ نظر حقارت مت دیکھو۔ جو عقلمند شخص ہے اسکو بھلا یہ خیال کب ہوسکتا ہے کہ تکبر اور غرور کے اندر مرتبہ کی بلندی ہے اس سے بڑھ کر اور کوئی مرتبہ تلاش مت

کرو کہ مخلوق تم کو یہ کہے کہ نہایت اچھے اخلاق والا شخص ہے ۔

نگرچو توئے برکبر آورد　　بزرگش نہ بینی بہ چشم خرد
تونیز از تکبر کنی ہم چناں　　نمائی کہ پیشت تکبر کناں
چو استادئی بر مقام بلند　　برافتادہ گرہوشمندی مخند
بسا ایستادہ در آمد زپائے　　کہ افتادہ گانش گرفتند جائے

ذرا غور کرو کہ اگر تم جیسا کوئی شخص تم پر تکبر کرے تو تم اس کو کبھی بزرگ سمجھنے کے لئے تیار نہ ہوگے، لہٰذا تم خود تکبر کی وجہ سے ایسا تو نہ کرو، جس طرح تمہارے سامنے اور اہل تکبر کرتے ہیں اور تم کسی بلند مقام پر کھڑے ہو تو عقلمندی کی بات تو یہ ہے کہ نیچے گرے ہوؤں پر نہ ہنسو، اس لئے کہ ایسا بہت ہوتا ہے کہ کھڑا ہونے والا پھسل کر نیچے گر جاتا ہے اور نیچے پڑے ہوئے لوگ اس کی جگہ لے لیتے ہیں ۔

گرفتم کہ خود ہستی از عیب پاک　　تعنت مکن برمن عیب ناک
یکے حلقۂ کعبہ دارد بدست　　یکے در خراباتے افتادہ مست
گر آنرا بخواند کہ نگزاردش　　وزیں را براند کہ بازاردش
نہ مستظہرست ایں باعمال خویش　　نہ آنرا در توبہ بہ بست است پیش

یعنی میں تسلیم کرتا ہوں کہ تم عیب سے پاک ہو اور پارسا ہو لیکن مجھ گنہگار پر زیادتی کرنے کا تمہیں کیا حق ہے۔ ایک شخص اپنے ہاتھ سے کعبہ کا پردہ پکڑے ہوئے ہے اور دوسرا شراب خانہ میں مست پڑا ہوا ہے۔ اب اگر حق تعالیٰ اس شراب خانہ والے کو مقبول فرمالیں تو کون ہے جو اس کو نہ ہونے دے

اور اگر اس کعبہ والے کو اپنے در سے بھگا دیں تو کس کی مجال جو اس کو واپس لا سکے۔ نہ اس عبادت گذار کو اپنے اعمال پر تکیہ کرنے کا کوئی حق ہے اور نہ اس گنہگار کے لئے توبہ کا دروازہ ہی بند ہے۔ جب معاملہ یہ ہے تو پھر کسی زاہد کو کسی رند (آزاد) پر تکبر کرنے کا کیا حق پہونچتا ہے، اور اپنی عبادت پر تکیہ کرنا اس کو کب زیبا ہے۔

حضرت حافظؒ کا شعر ابھی میں نے پڑھا ہے فرماتے ہیں ۔

تکیہ برتقوی ودانش درطریقت کافریست　　راہرو گرصد ہنر دارد توکل بایدش

یعنی اپنی دانش وتقوی پر بھروسہ کرنا طریقت میں کفر ہے، راہرو اگر سینکڑوں علم وہنر رکھتا ہے تاہم اس کو توکل ہی کرنا چاہئے۔

حضرت مولانا تھانویؒ اس کو اس کیف وانداز سے پڑھا کرتے تھے کہ لوگوں کو لطف آجاتا تھا اور پڑھنے ہی کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ خود حضرت والا کا حال ہے اسی طرح حضرت مولانا تھانویؒ کبھی کبھی ان اشعار کو بھی پڑھا کرتے تھے ۔

غافل مرو کہ مرکب مردان مرد راہ　　در سنگلاخ بادیہ پیہا بریدہ اند
نومید ہم مباش کہ رندان بادہ نوش　　ناگہ بیک خروش بمنزل رسیدہ اند

یعنی غافل ہو کر مت چلو کہ مردانِ راہ کی سواری سنگلاخ جنگل میں پے در پے چلتی رہی ہیں۔ ناامید مت ہوجاؤ کہ شراب الٰہی کے پینے والے اچانک ایک نالہ میں منزل تک پہونچ جاتے ہیں۔

اسی طرح حضرتؒ اس شعر کو بھی بہت پڑھا کرتے تھے ۔

تو بندگی چو گدایاں بشرط مزد مکن — کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند

تم فقیروں کی طرح مزدوری کی شرط پر بندگی مت کرو اسلئے کہ تمہارا مالک تو خود ہی بندہ پروری کا طریقہ جانتا ہے۔

اور فرماتے ہیں ؎

ترسم کہ صرفہ نبرد روز بازخواست — مال حلال شیخ زآب حرام ما

یعنی مجھے ڈر ہے کہ قیامت کے دن شیخ کی حلال روٹی ہمارے حرام پانی سے سبقت نہ لے جاسکے گی۔

اس میں شک نہیں کہ یہ سب اشعار آب حیات اور تصوف کی روح اور اسکی جان ہیں۔ حضرت حافظؒ فرماتے ہیں ؎

زاہد غرور داشت سلامت نبرد راہ — رند از رہ نیاز بدارالسلام رفت

یعنی زاہد اپنے غرور اور پندار کی وجہ سے راہ صحیح وسالم نہ طے کر سکا اور رند راہ نیاز سے دارالسلام میں داخل ہو گیا۔

ہر زمانہ میں بزرگوں نے یہی سیرت پیش کی ہے۔ چنانچہ حضرت حاجی صاحبؒ فرماتے ہیں ؎

ہے عبادت کا سہارا عابدوں کے واسطے — ہے عصائے آہ مجھ بیدست وپا کے واسطے

اب ان سب باتوں کا وقت تو ہے، نہیں مگر آپ کے سامنے اس لئے بیان کرتا ہوں کہ اگر آپ سیکھ لیں گے تو اس کا نفع آپ ہی کو پہونچے گا۔

مضمون سابق یعنی حکایت حضرت عیسیٰ علیہ السلام و عابد ناپارسا پر مزید کلام سنیئے!

شیخ سعدی علیہ الرحمہ نے جو قصہ لکھا ہے کہ عبادت پرست نے جب اس گنہگار کو دیکھا تو اس کو بہت کچھ سخت سست کہا اسے مدبر بدنصیب اور ناداں کہا اور یہ کہا کہ اس کی مصاحبت سے اس لئے دور رہنا چاہتا ہوں کہ مبادا اس کی آگ کا کچھ حصہ مجھ پر نہ پڑ جائے حتیٰ کہ آخر میں یہاں تک کہہ دیا کہ ؎

بہ محشر کہ حاضر شود انجمن — خدایا تو با او مکن حشر من

یعنی اے اللہ! محشر میں جبکہ سب لوگ جمع ہونگے تو میرا حشر اس کے ساتھ نہ کیجیو تو اس کا یہ سب کہنا کبر کی بناء پر تھا اور کبر کسی میں بلا وجہ نہیں ہو جاتا بلکہ اسکے کچھ اسباب ہوتے ہیں اور یہاں وہ سبب یہ ہوا کہ عبادت کی وجہ سے وہ اپنے کو بزرگ سمجھنے لگا تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ میں تو عابد ہوں شب و روز اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہوں اس لئے مقبول بارگاہ ہوں حالانکہ اللہ تعالیٰ کے دربار میں بزرگوں کا حال تو یہ ہوتا ہے کہ ع

بزرگاں نہادہ بزرگی زسر

بزرگوں نے بزرگی کو سر سے رکھ دیا۔ مطلب یہ ہے کہ بزرگی کا خیال اپنے دماغ میں نہیں رکھتے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات نہایت مستغنی و بے نیاز ہے فرشتے جن کی غذا ہی طاعت ہے، وہ بھی اس کے حکم کے آگے گم سم اور سرنگوں ہیں۔

اللہ کی شانِ عالی و بے نیازی

شیخ سعدیؒ نے اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کا کچھ بیان بوستاں کے دیباچہ میں کیا ہے خوب کہا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ؎

یکے را بسر برنہد تاج بخت　　　یکے رابخاک اندر آرد زتخت

کلاہ سعادت یکے بر سرش　　　گلیمے شقاوت یکے دربرش

گلستاں کند آتشے برخلیل　　　گروہے بآتش بردزآب نیل

یعنی ایک کے سر پرخوش نصیبی کا تاج رکھتا ہے اورایک کوتخت سے اتار کر زمین پرلاتا ہے۔ کسی کے سر پرسعادت کی ٹوپی رکھ دی ہے اور کسی کے بدن پر شقاوت (بدبختی) کی کملی ڈال رکھی ہے۔ حضرت خلیل اللہ پرآگ کوگلستاں بنا دیااورایک جماعت کودریائے نیل سے (دوزخ کی) آگ میں لے گیا۔

گرآں ست منشوراحسان اوست　　　ورین است توقیرفرمان اوست

پس پردہ بیند عملہائے بد　　　ہمو پردہ پوشیدہ باٰلائے خود

بتہدید گر بر کشد تیغ حکم　　　بمانند کروبیاں صم وبکم

اگروہ اس کےفضل واحسان کا مظاہرہ ہےتو یہ اس کی عظمت حکم کا مشاہدہ ہے۔ برے اعمال کو پردہ کے پیچھے سے دیکھ لیتا ہےمگراس کے بعد اپنے انعام کے ذریعہ پردہ پوشی بھی کرتا ہے۔ اگروہ شاہی جلال کے ساتھ حکم کی تلوار کھینچے تو مقرب فرشتے بھی بس گم صم ہوکررہ جائیں۔

وگر در دہد یک صلائے کرم　　　عزازیل گوید نصیبے برم

بدرگاہ لطف وبزرگیش بر　　　بزرگاں نہادہ بزرگی زسر

اوراگروہ کرم کا اعلان کردے تو ابلیس کوبھی اپنی بخشش کی توقع ہوجائے اس سراپالطف وبزرگی کے دربار میں بزرگوں نے اپنے سرسے بزرگی اتارکر رکھ دی ہے۔ جب یہ شان ہےحق تعالیٰ کی تو وہاں آپ کی عبادت کو پوچھتا

کون ہے۔ بڑے بڑے ملائک شب وروز عبادت کرنے کے بعد بھی اپنے آپ کوقاصر ہی سمجھتے ہیں،مگراس عابد نےتھوڑی سی عبادت کی اوراپنے آپ کو بزرگ سمجھ لیا، یہی اس کے عدم اخلاص کی دلیل تھی اور یہ قاعدہ ہے کہ جوشخص خود بزرگ نہولیکن اپنے کو بزرگوں کے زمرہ میں شمارکرنا چاہتا ہوتو وہ اسی قسم کی باتیں کرتا ہے۔اس کے لئے بزرگی کاسنبھالناتو آسان نہیں ہوتا اس لئے لامحالہ اس کی جگہ ڈینگ ہی سے کام لیتا ہے۔اس شخص کوعبادت کا کچھ بھی فیض نہیں حاصل ہوا۔عبادت تو عابداورمعبود کے درمیان واسطہ ہوتی ہے اوراسے نہ اپنی ہی معرفت تھی اور نہ معبود کی، ورنہ تو اگر ذراسا حصہ معرفت کا نصیب ہوجاتا تو اسے عجب وکبر سوجھتا؟ اوردوسروں پرنظر جاتی؟ یا خوداپنی فکر پڑ جاتی اورقلب خشیت اورخوف سے بھر جاتا۔ چنانچہ شیخ سعدیؒ نے اسی کتاب میں ایک حکایت دہقان اورلشکر سلطان کی بیان کی ہے، جس کے ذریعہ سے اس بات کوسمجھا دیا ہے۔

حکایت کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی دیہات کے ایک رئیس اوراسکے لڑکے کا گذر بادشاہ کےلشکر پر ہوا،لڑکے نے جب لشکریوں کے ساز وسامان کودیکھا اورفوجیوں کے کروفر کا مشاہدہ کیااور یہ دیکھا کہ ان سب کے سامنے میراباپ بالکل کمتر ہے ذلیل معلوم ہوتا ہے تو اس نے باپ سے پوچھا کہ آخرآپ یہاں اس قدر مسکین اورمتواضع کیوں نظر آرہے ہیں۔آخرآپ بھی تو گاؤں کے چودھری ہیں اور بہت سے سرداروں سے بڑھکر ہیں۔ پھر یہ آپ کا کیا حال ہورہا ہے کہ اس قدر گھبرائے ہوئے ہیں کہ جیسے مرہی جائیں گے۔اور

بادشاہ کے سامنے اس طرح کانپ رہے ہیں جیسے درخت ہلتا ہے۔لڑکے کے اس سوال کا جواب جو باپ نے دیا بس میرا مقصود یہاں اسی کا بیان کرنا ہے اس نے کہا۔

بلے گفت سالار فرماں دہم / ولے عزتم ہست تا در دہم
بزرگاں ازاں دہشت آلودہ اند / کہ در بارگاہ ملک بودہ اند
تواے بےخبر ہم چناں در دہی / کہ بر خویشتن منصبے می نہی

یعنی باپ نے کہا کہ ہاں بیشک میں سردار بھی ہوں اور حکمراں بھی ہوں لیکن میری عزت بس گاؤں تک ہے۔آگے شیخ سعدیؒ بطور تتمہ کے فرماتے ہیں کہ بزرگان دین پر ہر وقت جو خوف و ہراس طاری رہتا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ شاہی دربار میں ہوتے ہیں اور تو اے بےخبر! اگر ابھی اپنے لئے کوئی منصب اور مقام سمجھتا ہے تو یہ جان لے کہ تو بھی دیہات ہی میں ہے۔

یہ حکایت میں نے اس پر سنائی کہ اس عابد کو اگر معرفت کا کچھ حصہ ملا ہوتا تو اس کی نظر خود اپنے سے اور اپنی عبادت سے اٹھ چکی ہوتی لیکن جب اس پر نظر باقی ہے تو معلوم ہوا کہ معرفت کا کوئی حصہ اسے حاصل نہیں ہوا۔طریق نام ہے فنا کا، عابد پر جب عبادت اثر کر جاتی ہے تو وہ یادِ محبوب میں غرق ہو جاتا ہے اور اپنے وجود کو ان کے وجود میں فنا کر دیتا ہے۔

شیخ نے اس مسئلہ کو بھی حکایت (کرمک شب تاب) کا عنوان قائم فرما کر نہایت ہی دلکش عنوان سے ثابت کیا ہے فرماتے ہیں ۔

مگر دیدہ باشی کہ در باغ وراغ / بتابد بشب کرمکے چوں چراغ

یعنی تم نے اکثر باغ و بیابان میں دیکھا ہوگا کہ رات کے وقت ایک چھوٹا سا کیڑا چراغ کی طرح چمکتا پھرتا ہے۔

یکے گفت اے مرغکے شب فروز / چہ بودت کہ بیروں نیاید بروز

یعنی کسی نے اس سے دریافت کیا کہ اے رات کو چمکنے والے چھوٹے کیڑے تو دن میں باہر کیوں نہیں نکلتا۔

ببیں کآتشیں کرمکے خاک زاد / جواب از سر روشنائی چہ داد

یعنی دیکھو مٹی سے پیدا ہونے والے اس آتشی کیڑے نے کیسی عقل مندی کا جواب دیا۔

کہ من روز و شب جز بہ صحرا نیم / ولے پیش خورشید پیدا نیم

اس نے کہا کہ میں تو رات و دن جنگل میں رہتا ہوں ہاں مگر اتنی بات ہے کہ آفتاب کے آگے میرا وجود نظر نہیں آتا۔

سبحان اللہ! فنا کے مسئلہ کو کس طرح معمولی قصوں سے ثابت فرمایا ہے واقعی گنہگار کے مقابلہ میں اس عابد کی زبان جو قینچی کی طرح چلی تو اسی لئے کہ اس نے اپنے وجود کو ختم نہیں کیا تھا اور نہ اس مسکین کو معرفت کی ہوا لگی تھی ورنہ تو ''آنرا کہ خبر شد خبرش باز نیامد'' کا مصداق ہوتا نہ کہ اس قسم کے تکبر کے کلمات زبان پر لاتا۔

عابد کی مذمت کی وجہ

میں پہلے کہہ چکا ہوں اور اب پھر کہتا ہوں کہ شیخ نے عابد ناپارسا کی جو کچھ مذمت بیان کی ہے وہ اس کی عبادت کی بناء پر نہیں ہے بلکہ اسکی ناپارسائی

کی بناء پر کی۔ ورنہ عبادت کا شرف اور فضل تو نص سے ثابت ہے، حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں ”وَلَقَدْ کَتَبْنَا فِی الزَّبُوْرِ مِن بَعْدِ الذِّکْرِ اَنَّ الْاَرْضَ یَرِثُهَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ“، یعنی ہم (سب آسمانی) کتابوں میں لوح محفوظ (میں لکھنے) کے بعد لکھ چکے ہیں کہ اس زمین (جنت) کے مالک میرے نیک بندے ہوں گے۔

اس میں زمین سے مراد اگرچہ ارض جنت کو کہا گیا ہے تاہم حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ ”المراد بها ارض الدنيا يرثها المؤمنون ويستولُون عليها وهو قول الكلبي وايدبقوله تعالىٰ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ“، یعنی ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ مراد اس سے دنیا ہی کی زمین ہے، جس کے وارث مؤمن ہونگے، اور ان کا اس پر تسلط ہوگا۔ کلبی کا بھی یہ قول ہے جس کی تائید میں حق تعالیٰ کا یہ ارشاد پیش کیا ہے کہ وہ ان کو زمین کا ضرور بالضرور خلیفہ بنائے گا۔ بہر حال آگے حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں ”اِنَّ فِیْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِیْنَ وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ“، یعنی بلا شبہ اس میں کافی مضمون ہے ان لوگوں کے لئے جو بندگی کرنے والے ہیں اور ہم نے آپ کو کسی اور بات کے واسطے نہیں بھیجا مگر دنیا کے لوگوں پر مہربانی کرنے کے لئے۔

زمین کی وراثت کس کے لئے ہے

دیکھئے اس آیت میں بلاغ اور کفایت کو قوم عابدین کے ساتھ مخصوص

فرمایا ہے، جس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ زمین کی وراثت چاہتے ہو تو عبادت کرو۔ اس سے عبادت کی تعریف نکلی۔ مگر مراد اس سے وہ عبادت ہے کہ جس میں عابد حق تعالیٰ کی رضا کا قصد کرے نہ ایسی کہ ایک جانب عبادت بھی کرتا جائے اور دوسری جانب اس کی بدحالی بھی بڑھتی جائے، جیسا کہ اس ناپارسا کا حال ہوا۔ اس جیسی عبادت کی تعریف نہیں کی جائیگی کیونکہ وہ حق تعالیٰ کی عبادت ہی نہیں بلکہ مخلوق کی خاطر ہے اور عبادت کی عبادت ہے۔ اسی واسطے شیخ نے اس کو عبادت پرست فرمایا ہے۔ اس قسم کے لوگ اندر اندر اپنے ہی معتقد ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس لئے جتنا کرتے جاتے ہیں اتنا ہی ان کے اخلاق خراب ہوتے جاتے ہیں اور مخلوق نے اگر کچھ تعریف وغیرہ کردی، تب تو یہ اور بگڑ گئے۔ یہ لوگ دیکھتے ہیں کہ جب ان کی ریائی عبادت کی وجہ سے ایک مخلوق دھوکے میں آکر ان کے پیچھے پیچھے ہولیتی ہے تو ان کی نظر اپنے خداع اور بدباطنی پر نہیں جاتی، بلکہ الٹے اپنے کو بزرگ سمجھنے لگتے ہیں۔ حالانکہ اللہ کے یہاں سے ان کا پتہ کٹ جاتا ہے۔

او چو بیند خلق را ازمست خویش　　از تکبر می رود از دست خویش

یعنی وہ جب مخلوق کو اپنا سرمست دیکھتا ہے تو تکبر سے اپنے ہاتھ سے نکل جاتا ہے، یعنی بے قابو ہو جاتا ہے۔

اور اس کا مصداق ہو جاتے ہیں کہ

یہ تیلی کے کچھ بیل سے کم نہیں ہیں　　پھرے رات بھر پھر جہاں تھے وہیں ہیں

میں یہ کہہ رہا ہوں کہ عبادت اور عابدین کی مدح تو منصوص ہے۔ اور

یہاں شیخ ان کی مذمت کررہے ہیں تو بات یہ ہے کہ یہ لوگ عابد ہی نہیں اور اس کی دو وجہ ہے ایک تو یہ کہ ان کو اپنی عبادت کا زعم ہو جاتا ہے۔ اور دوسری چیز یہ کہ ان میں ریاکاری کی وجہ سے حمق پیدا ہو جاتا ہے، اور جو اللہ کا طالب ہوتا ہے اس کی عقل درست ہوتی ہے۔

عارف عقلمند ہوتا ہے

چنانچہ عارف سب سے زیادہ عاقل ہوتا ہے، ان لوگوں کے اس قسم کے دعوے خود ان کے مفاد کے بھی خلاف ہوتے ہیں، کیونکہ لوگ بھی اہل دعویٰ کو پہچان ہی لیتے ہیں، اور ان سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ان کے لئے کتنے نقصان کی بات ہے، کیونکہ ریاکاری سے جو مقصود ہے اس کے خلاف ہے مگر اس حمق کے اختیار کرنے پر یہ لوگ مجبور بھی ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے یہاں سے جب کچھ ملا نہیں ہوگا تو ایسے شخص کے لئے اس قسم کی خرافات اور بکواس لازم حال ہو جاتی ہے، جب آدمی سچا نہ ہوگا تو لامحالہ جھوٹا ہوگا۔ اب جھوٹے لوگوں سے سچوں کے حالات کیسے پیدا ہو سکتے ہیں۔ مسیلمہ کذاب کے متعلق لکھا ہے کہ اپنے یہاں اذان میں اپنے لئے بھی رسالت کی گواہی دلواتا تھا، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا بھی اعلان کراتا تھا گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مساوات کا دعویٰ تھا۔ سمجھتا تھا کہ آپ کا انکار تو چلے گا نہیں اس لئے آپ کے ساتھ ساتھ اپنے کو بھی شامل کر لیا کرتا تھا۔ اس لئے علماء نے فرمایا ہے کہ جو شخص کچھ نہ ہو اور دعویٰ کسی کمال کا کرے وہ مسیلمہ

کذاب کا بھائی ہے۔ شیخ نے اسی لئے اس واقعہ کو بیان کیا تاکہ آپ کو ایسے لوگوں کی معرفت کرادیں کہ جب دعویٰ ہو تو سمجھ لو کہ کچھ نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کے درگاہ سے راندہ ہوا ہے۔

یہاں اس واقعہ میں بھی عابد کو اپنی عبادت پر ناز پیدا ہو گیا تھا، تقاضائے عبادت کے بالکل خلاف، کیونکہ عبادت کی وجہ سے تو اس کے اندر تواضع' مسکنت' خاکساری اور انکسار پیدا ہو جانا چاہئے تھا، مگر بجائے اس کے رفعت' تعلّی' کبر یہ سب رذائل پیدا ہو گئے جو کہ معصیت کے خواص تھے، اور اس نے اپنی طاعت پر نظر کی اور اس پر تکیہ کیا اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اپنے کو بے نیاز جانا، اسے عبادت کا ناز پیدا ہو گیا، اور نیک لوگوں میں یہ چیزیں پیدا ہو ہی جاتی ہیں، اور اس میں شک نہیں کہ یہ عجب بڑی ہی دشوار گزار گھاٹی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی فضل فرمادیں تو انسان اس سے بچ سکتا ہے ورنہ بہت مشکل ہے، اپنی عبادت پر تکیہ وبھروسہ کے بارے میں بزرگان دین کا یہ فتویٰ ہے کہ کافری ہے۔ چنانچہ حضرت حافظ صاحبؒ فرماتے ہیں ؎

تکیہ برتقویٰ ودانش درطریقت کافریست — راہرو گر صد ہنر دارد توکل بایدش

ترجمہ: اپنی عقل اور تقویٰ پر بھروسہ کرنا طریقت میں کافری کے مثل ہے۔ سالک اگر سینکڑوں ہنر رکھتا ہے، تاہم اس کو توکل ہی رکھنا چاہئے۔

اور کافری اس لئے ہے کہ مؤمن کا تکیہ اللہ پر ہوتا ہے اس کے فضل اور کرم پر ہوتا ہے اب غیر اللہ پر تکیہ کرنا ظاہر ہے کہ یہ کافروں ہی کی صفت ہو سکتی ہے۔

ایک اہم تحقیق

یہاں ایک بات یہ سمجھئے کہ جس طرح تکیہ زہد وطاعت پر ہوتا ہے اسی طرح کبھی معصیت پر بھی ہوجاتا ہے، یعنی گنہگار کی نظر حق تعالیٰ کے عفو وکرم سے ہٹ کر اپنی معصیت پر مقصور ہوجاتی ہے۔ چنانچہ جب وہ اپنے گناہوں کی کثرت پر نظر کرتا ہے تو اس میں ایک یاس کی سی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے، یعنی وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اب میں بخشا ہی نہ جاؤں گا، گویا ایک طرح سے اللہ تعالیٰ کے عفو وکرم سے اس کی نظر ہی ہٹ جاتی ہے۔ اس کو بھی مشائخ فرماتے ہیں کہ یہ خطرناک حال ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ تو گنہگاروں کے متعلق یہ فرماتے ہیں کہ "**قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا**" یعنی اے وہ لوگو! جنھوں نے معصیت کر کے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے، اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو، بے شک اللہ تعالیٰ گناہوں کو بخش بھی دیا کرتے ہیں۔ اسلامی عقیدہ تو یہ ہے، اور یہ شخص اپنی عقل سے یہ حکم لگا رہا ہے کہ گویا اللہ تعالیٰ اس کو بخش ہی نہیں سکتے، پس یہ نہایت ہی مہمل اور بے عقل شخص ہے۔

بہرحال تکیہ خواہ طاعت پر ہو یا معصیت پر دونوں مذموم ہیں اور طاعت پر تکیہ عابد کو اس لئے ہوجاتا ہے کہ اس کی نظر "**اُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ**" پر نہیں رہتی اور عاصی جو اپنی معصیت پر تکیہ کر لیتا ہے تو اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد "**لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ**" اس کے پیش نظر نہیں رہتا۔ لہٰذا اعتدال کی راہ

یہ ہے کہ عابد کو تو چاہئے کہ اگر وہ ایک جانب اپنی عبادت سے خوش ہوتا ہے تو ہو لیکن اس کو چاہئے کہ دوسری جانب اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بھی ڈرتا رہے۔ اسی طرح گنہگار اگر معاصی سے خوف کرتا ہے تو کرے مگر ساتھ ہی ساتھ اسے اللہ تعالیٰ کے غفور ورحیم ہونے کا عقیدہ بھی پیش نظر رکھنا چاہئے۔ پس عاصی کے اندر اگر یہ وصف موجود ہو تو باوجود معصیت کے اس کا یہ خوف اس کا کام بنا دیگا جیسا کہ آپ نے عابد ناپارسا کی حکایت میں گنہگار کا حال دیکھا۔ لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان معصیت کرتا ہے اور اس پر جری ہوتا ہے، ندامت اور انابت تو الگ رہی گناہ کر کے اس پر فخر کرتا ہے، رات کو گناہ کرتا ہے اور دن میں لوگوں سے اس کو ہنسی خوشی بیان کرتا ہے، اس کا نام جرأت ہے، اس پر اس سے قیامت میں مواخذہ ہوجائیگا۔

بہرحال یہ حق تعالیٰ کی تربیت ہے کہ ایک نیک آدمی کو رحمت کے خیال کے ساتھ ساتھ عذاب کا دھیان بھی رکھنے کو فرمایا، اور عاصی کو خوف وخشیت کے ساتھ ساتھ رحمت کی جانب بھی متوجہ فرمایا۔

ف: سبحان اللہ! کیا ہی خوب شریعت کی حکمت کو بیان فرمایا گویا "الایمان بین الرجاء والخوف" کی تشریح فرمادی۔ (قمر الزمان)

یہاں ایک بات اور سمجھ لیجئے کہ شیخ سعدیؒ نے اس حکایت میں اس عابد کو جو ناپارسا کہا تو اس سے معلوم ہوا کہ عابد دو طرح کے ہوا کرتے ہیں ایک پارسا اور ایک ناپارسا۔ اب یہ بات کہ عابد ناپارسا کون کہلاتا ہے تو اس کے متعلق کہتا ہوں کہ شیخ نے اس حکایت سے پہلے جو مضمون بیان کیا ہے، اس کی

سرخی یہ قائم کی ہے کہ ''گفتار در عجب و عاقبت آں و شکستگی و برکت آں'' عجب اور اس کے نتیجہ ونحوست اور شکستگی اور اس کی برکت کے بیان میں۔

اس میں ایک نصیحت یہ بھی فرمائی کہ ؎

گرفتم کہ خود ہستی از عیب پاک — تعنت مکن برمن عیب ناک

ترجمہ: میں نے مانا کہ تو عیب سے پاک ہے، تاہم ہم جیسے عیب دانوں پر نکیر نہ کرو۔

یعنی اگر کوئی شخص خود عیوب سے پاک ہو تو سبحان اللہ کیا کہنا، مگر جو لوگ کہ اہل معصیت اور اہل عیب ہیں ان کے متعلق طعن اور عیب گوئی بھی نہ کرنی چاہئے۔ اس سے ان کی نیکی کی تکمیل ہوگی اور وہ عابد پارسا کہلائے گا ورنہ اگر اپنی عبادت کے ساتھ ساتھ دوسروں کی تحقیر اور تذلیل بھی پیش نظر رہی تو یہ شخص بظاہر عابد تو کہلائے گا مگر پارسا نہ ہوگا اس سے معلوم ہوا کہ عابد ہونا تو آسان ہے مگر پارسا ہونا مشکل ہے۔ چنانچہ یہاں یہ جو ناپارسا کہلایا تو اسی لئے کہ اس گنہگار کے ساتھ نہایت ہی بدخلقی اور ترش کلامی سے پیش آیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ جب شیخ سعدیؒ نے نیکوں کو تعنت سے منع فرمایا تو اس کے بعد ہی عابد ناپارسا کی حکایت بیان کر کے اس تعنت کی توضیح فرمادی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس کے ناپارسا ہونے کا سبب اس کا یہی تعنت تھا اور اس تعنت کا سبب یہ بنا کہ اس نے اپنے آپ کو بزرگ سمجھ لیا تھا اور اپنے عمل پر اس کی نظر ہوگئی تھی جس کی وجہ سے دوسروں کی حقارت قلب میں پیدا ہوگئی تھی۔

بزرگوں کی تعلیم

سبحان اللہ! بزرگوں کی ان تعلیمات سے پتہ چلتا ہے کہ اخلاق کا معیار کس قدر بلند ہے کہ ایک شخص جو گناہوں سے محفوظ بلکہ معصوم ہی کیوں نہ ہو، اس کو بھی یہ حق نہیں دیا گیا کہ کسی گنہگار کو حقیر سمجھے اس کی خیریت اسی میں ہے کہ اپنے ہی کو حقیر سمجھے اور دوسروں کو بہ نظر توقیر دیکھے، کیونکہ اعتبار خاتمہ کا ہے اور اس کی خبر نہیں۔ رہا عمل تو اس پر کوئی کیا فخر کر سکتا ہے، جب کہ حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی شخص اپنے عمل کی وجہ سے جنت میں نہ جائے گا۔ اس پر حضرت عائشہؓ کو تعجب بھی ہوا۔ عرض کیا کہ یا رسول اللہ کیا آپ بھی اپنے عمل کی وجہ سے جنت میں نہ جائینگے؟ آپ نے فرمایا کہ ہاں میں بھی، مگر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہی مجھے ڈھانپ لے۔ یہ مسئلہ اس عابد ناپارسا کو نہیں معلوم تھا یا اس پر اس کا عمل نہ تھا۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو اپنے قول وفعل اور حال سب کے ذریعہ سے اپنی امت کو سمجھایا ہے، اور امت نے اسے سمجھا ہے۔ چنانچہ شیخ سعدیؒ نے بوستاں کے شروع ہی میں جو نعت لکھی ہے، اس میں کس قدر عاجزی اور تواضع کے اشعار لائے ہیں کہ سبحان اللہ ان کے پڑھنے سے ہی آدمی میں ایک حال پیدا ہو جاتا ہے اور اللہ ورسول کا مرتبہ اور اپنی حقارت وپستی سامنے آجاتی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

خدایا بحق بنی فاطمہ — کہ برقول ایماں کنم خاتمہ

اگر دعوتم رد کنی ور قبول   من ودست ودامان آل رسول
چہ گم گردداے صدرفرخندہ پے   ز قدر رفیعت بدرگاہ حے
کہ باشند مشتی گدایان خیل   بہ مہمان دارالسلامت طفیل

اے اللہ! حضرت فاطمہ کی اولاد کے طفیل میں یہ درخواست ہے کہ میرا خاتمہ ایمان پر ہو۔آپ میری دعا کوخواہ رد کریں یا قبول کریں قیامت میں میں ہوں گا اور میرا ہاتھ ہوگا اورآل رسول کا دامن ہوگا۔اے بلند مرتبہ کے صدرنشیں حق تعالیٰ کی درگاہ میں جو آپ کا مرتبہ عظیم ہے، اس میں کیا کمی آجائیگی اگرمٹھی بھر جماعت یعنی فرماں بردارفقراءآپ کے طفیل بہشت کے مہمان بن جائیں۔

خدایت ثناگفت وتبجیل کرد   زمیں بوس قدرتوجبرئیل کرد
بلندآسماں پیش قدرت خجل   تو مخلوق وآدم ہنوزآب وگل

یعنی اللہ تعالیٰ نے آپ کی ثنا کی ہے، اور جبرئیل علیہ السلام نے آپ کی قدرکی زمین کوبوسہ دیاہے۔بلندآسمان آپ کی قدرومنزلت کے آگے شرمندہ ہے اورآپ کی تخلیق ہوچکی تھی درانحالیکہ آدم علیہ السلام ہنوزآب وگل ہی میں تھے۔

تواصل وجود آمدی از نخست   دگر ہرچہ موجودشدفرع تست
ندانم کدامی سخن گویمت   کہ والاتری زانچہ من گویمت
تراعزلولاک تمکیں بس است   ثنائے توطہٰ ویٰسیں بس است
چہ وصفت کندسعدیٔ ناتمام   علیک الصلوٰۃ اے نبی والسلام

یعنی آپ ابتدا ہی سے ساری کائنات کے وجود کے اصل تھے، بعد میں

جو چیزیں معرض وجود میں آئیں وہ آپ ہی کی فرع ہیں۔میں اس بات کے سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آپ کی شان میں کون سی ایسی بات کہوں جو آپ کو پسند آجائے، کیونکہ میں جو کچھ بھی کہوں گا آپ اس سے کہیں بالا وبرتر ہیں۔ آپ کے مرتبہ کے لئے ”**لولاک لما خلقت الافلاک**“ (یعنی اگر آپ نہ ہوتے تو میں آسمانوں کو پیدا نہ کرتا) کا شرف ہی کافی ہے اورآپ کی ثنا کیلئے طہٰ ویٰس کافی ہے۔یہ نااہل سعدی آپ کا کیاوصف بیان کرسکتا ہے بس اے نبی آپ پراللہ ہی کا درودوسلام ہو۔

دیکھئے شیخ نے اپنی کتاب کی ابتداکس قدر پاکیزہ عنوان یعنی حمد باری سے کی ہے۔پھررسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جونعت لکھی وہ بھی نہایت مؤثر انداز میں کہ ہر ہر شعرادب اورتواضع میں ڈوبا ہوا ہے۔اور سنئے اپنی اسی کتاب کے باب چہارم میں سیدالطائفہ حضرت جنیدؒ کی تواضع کا ایک واقعہ بیان کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بزرگان دین کورسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے کس قدر شغف اورمناسبت رہی ہے کہ جوانداز کسر وانکسار کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیارفرمایا خواص امت بھی اسی پر چل پڑے،اور اپنے عمل سے یہ ثابت کردیا کہ راہ یہی ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔

شنیدم کہ بردشت صنعاجنید   سگے دید بر کندہ دندان صید
زنیروئے سر پنجۂ شیرگیر   فرو ماند عاجز چو روباہ پیر
پس ازعزم وآہوگرفتن بہ پے   لگد خوردہ از گوسپندان حی

یعنی میں نے سنا کہ صنعا کے جنگل میں حضرت جنیدؒ نے ایک کتے کو دیکھا

جس کے شکار کرنے والے دانت گر چکے تھے، اور شیر کو پکڑنے والے پنجے کی طاقت بھی کھو چکا تھا، اور مانند بوڑھی لومڑی کے عاجز ہو گیا تھا۔ یا تو پہاڑی بکرے کو شکار کرنے کے بعد ہرن کا شکار کر لیتا تھا اور یا اب قبیلہ کی بھیڑوں کی لات کھاتا تھا۔

چوں مسکین وبیطاقتش دیدوریش　　　بدوداد یک نیمہ از زاد خویش

شنیدم کہ میگفت وخوں می گریست　　　کہ داند کہ بہتر ز ماہر دو کیست

بظاہر من امروز ازیں بہترم　　　دگر تاچہ راند قضا برسرم

حضرت جنیدؒ نے جب اسے مسکین کمزور اور زخمی دیکھا تو اپنے توشہ میں سے ایک ٹکڑا اس کے آگے بھی ڈال دیا۔ میں نے سنا کہ حضرت جنید یہ کہتے تھے اور خون کے آنسوں روتے تھے کہ کون جانتا ہے کہ ہم دونوں میں سے عنداللہ کون بہتر ہے، گو بظاہر آج میں اس سے بہتر معلوم ہوتا ہوں، لیکن کل کو میرے سر پر قضا کیا گذارے گی کچھ خبر نہیں ۔

گرم پائے ایماں نہ لغزد ز جائے　　　بہ سر برنہم تاج عفو خدائے

وگر کسوت معرفت در برم　　　نہ ماند بہ بسیار ازیں کمترم

کہ سگ باہمہ زشت نامی چومرد　　　مرو را بدوزخ نہ خواہند برد

یعنی اگر میرے ایمان کے قدم نے اپنی جگہ سے لغزش نہیں کی تو حق تعالیٰ کے عفو کا تاج سر پر رکھوں گا، اور اگر خدانخواستہ معرفت ہی کا لباس ہمارے اوپر نہ رہ جائے یعنی ہم اس سے خالی ہو جائیں تو پھر میں کتے سے کہیں کمتر ہوں، اور یہ مجھ سے کہیں بڑھکر ہے اس لئے کہ کتے میں ہزار برائی سہی

مگر جب وہ مر جائے گا تو دوزخ میں اس کو نہ لے جائیں گے اور انسانوں کے لئے تو دوزخ بھی ہے ۔

رہ این ست سعدی کہ مردان راہ　　　بہ عزت نہ کردند در خود نگاہ

ازیں بر ملائک شرف داشتند　　　کہ خودرا بہ از سگ نہ پنداشتند

سبحان اللہ! حکایت کا خلاصہ کیا عمدہ بیان فرمایا ہے کہ اے سعدی راہ بس یہی ہے کہ سالکان طریقت نے کبھی اپنے اندر عزت کے ساتھ نگاہ نہیں کی یعنی عجب وخود پسندی میں مبتلا نہیں ہوئے بلکہ ہمیشہ تواضع ہی اختیار کی چنانچہ فرشتوں سے اسی لئے شرف میں بڑھ گئے ہیں کہ انھوں نے اپنے کو کبھی کتے سے بھی اچھا نہیں سمجھا۔

شیخ سعدی کے کلام کی ابتدا اور وسط تو آپ نے ملاحظہ فرمایا، اب کلام کی انتہا بھی دیکھئے چونکہ اختتام کے مناسب رجاء ہے اس لئے شیخ نے اس کا طریقہ بھی سکھلایا بلکہ دعا کر کے یہ بتلا دیا کہ اس طرح سے بندہ کو اللہ تعالیٰ کی رحمت پر نظر رکھنا چاہئے، اور اس میں شک نہیں کہ شیخ نے بہت ہی خوب بیان کیا ہے فرماتے ہیں ۔

دلم می دہد وقت وقت ایں امید　　　کہ حق شرم دارد ز موئے سپید

عجب دارم اوشرم دارد زمن　　　کہ شرمم نمی آید از خویشتن

یعنی میرا دل رہ رہ کر مجھے یہ امید دلاتا ہے کہ حق تعالیٰ سفید بال والے مومن سے شرماتے ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے کہ حق تعالیٰ کو مجھ سے شرم آتی ہے تو میرے لئے یہ بڑے تعجب کا مقام ہے کہ مجھے اپنے سے شرم نہیں آتی۔

نہ یوسف کہ چندیں بلا دید و بند　　چو حکمش رواں گشت وقدرش بلند
گنہ عفوکرد آل یعقوب را　　کہ معنی بود صورت خوب را
بکردار بدشاں مقید نہ کرد　　بضاعات مزجات شاں ردنکرد

تم نے نہیں سنا کہ یوسف علیہ السلام نے باوجود یکہ اس قدر مصیبت جھیلی اور قید وبند میں رہے مگر جب حاکم ہوئے اور ان کا مرتبہ بلند ہو گیا تو آل یعقوب علیہ السلام کے قصور کو معاف کر دیا اور کیوں نہ ہوتا جب اللہ تعالیٰ نے انھیں صورت کے اعتبار سے حسین بنایا تھا تو اسی کے شایان شان حسن سیرت سے بھی نوازا تھا اس لئے انکی بداخلاقی کے سبب انھیں قید نہیں کیا اور ان کی کھوٹی پونجی کو رد نہیں فرمایا، پس جب ایک نبی کی عفو وکرم کا یہ حال ہے تو ؎

زلطفت ہمیں چشم داریم نیز　　بدیں بے بضاعت بہ بخش اے عزیز
بضاعت نیاوردم الا امید　　خدایا زعفوم مکن ناامید

اسی طرح اے اللہ آپ کے لطف وکرم سے بھی ہم امید رکھتے ہیں کہ اس بے سرمایہ کو محض اپنے لطف وکرم سے بخش دیں گے۔ میں بھی کوئی پونجی لے کر نہیں آیا ہوں سوائے رجا اور امید کے لہٰذا اے خدا مجھ کو اپنے عفو سے ناامید نہ فرمایئے۔

دیکھا آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ''**انا البائس الفقیر**'' ارشاد فرما کر امت کو جو تعلیم کی تھی تو امت نے اسے کیسا سیکھا اور کیسا عمل کیا؟

باقی یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اعتراف ذنب (گناہوں کا اقرار) کا سبب کیا ہوا، جب کہ آپ معصوم بھی تھے، اس کے متعلق سنئے!

اعتراف ذنب کا سبب

قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ ''وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلاً صَالِحاً وَّاٰخَرَ سَيِّئاً'' ''اور کچھ اور لوگ ہیں جو اپنی خطا کے مقر ہو گئے جنہوں نے ملے جلے عمل کئے تھے کچھ بھلے اور کچھ برے''۔

اس میں اعتراف ذنب کرنے والوں کی فضیلت اور ان کی مدح فرمائی گئی ہے تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن کی شان ہی یہ تھی کہ ''**کان خلقه القراٰن**'' کس طرح اس فضیلت کے حاصل کرنے سے صرف نظر فرماتے اور یہ ظاہر ہے کہ ہر فضل وکمال انبیاء علیہم السلام میں بدرجہ اتم پایا جاتا ہے اس لئے آپ نے بھی خود کو مذنبین کی صف میں کھڑا کر کے باوجود معصوم ہونے کے ایسا اعتراف ذنب کیا اور اس طرح گریہ وزاری فرمائی کہ اس منصب کا حق ہی ادا کر دیا اور توبہ واستغفار میں بھی سب سے بڑھ گئے۔

سبحان اللہ! دیکھئے آپ نے کیسے کیسے کلمات فرمائے کہ دوسرا کوئی اس طرح کہنے پر قادر ہی نہیں تھا، یہ فرمایا کہ ''میں مصیبت زدہ ہوں محتاج ہوں، فریادی ہوں، پناہ جو ہوں، ترساں وہراساں ہوں، اپنے گناہوں کا اقرار واعتراف کرنے والا ہوں، سوال کرتا ہوں تجھ سے سوال بیکس کا سا، گڑگڑاتا ہوں تیرے سامنے گڑگڑانا گنہگار ذلیل کا سا، اور طلب کرتا ہوں تجھ سے طلب کرنا خوف زدہ آفت رسیدہ کا سا، اور طلب کرنا اس شخص کا سا کہ جھکی

ہوئی ہو تیرے سامنے گردن اس کی، اور بہہ رہے ہوں تیرے روبرو آنسو اس کے۔ اور دعا مانگتا ہوں تجھ سے اس شخص کی سی جو فروتنی کیئے ہوئے ہو تیرے سامنے، اور رگڑتا ہو تیرے سامنے ناک اپنی"۔

سبحان اللہ! اعتراف ذنب کا کیسا نقشہ کھینچا ہے اور اس کے ذریعہ گنہگاروں کی کس قدر دلجوئی اور تسکین فرمائی ہے اور کس قدر عنایت ہے گنہگاروں کے حال پر کہ ان کی یوں تسلی فرمادی کہ میں ان کا بھی نبی ہوں اگر میں ہی چھوڑ دوں گا تو پھر وہ کہاں جائیں گے۔ اس لئے اپنے کو ان کی صف میں لاکر گناہوں کا اعتراف فرمایا۔

واقعی کوئی شیخ ایسا نہیں ہے جو اس طرح مرید کے مقام پر نزول کر کے ان کی تربیت کرے جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم تو یہ تھی جو آپ نے ملاحظہ فرمایا لیکن کتابوں میں سید گیسو درازؒ کا ایک عجیب واقعہ لکھا ہے اور یہ بڑے شخص ہوئے ہیں کسی نے ان کے بارے میں لکھا ہے ؎

ہر کو مرید سید گیسو دراز شد واللہ خلاف نیست کہ او عشق باز شد

واقعہ یہ ہے کہ صاحب مرأۃ الاسرار لکھتے ہیں کہ میں گیسو دراز قدس سرہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انھوں نے مجھے روپیہ دیا کہ شراب خرید لاؤ۔ میں نے تعمیل حکم کی۔ فرمایا کہ پیالہ میں پر کر کے مجھے دو میں نے پیش کیا۔ شیخ نے نوش فرمایا۔ پھر مجھ سے فرمایا کہ تم بھی ایک پیالہ پیو۔ مجبورا میں نے بھی "**الامر فوق الادب**" کے خیال سے ایک پیالہ پی لیا۔ حق تعالیٰ علیم ہیں کہ

وہ شہد خالص تھا۔ سبحان اللہ: کیا احوال کیا اسرار، اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ سالکین کو نہایت سلوک میں جب اپنی عبادت پر نظر اور عجب ہوتا ہے تو اپنے کو معصیت میں ڈال کر اپنے عجب کا ازالہ کرتے ہیں۔ پھر جب یہ حضرات اپنے کو اس درجہ گرادیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ بھی ان کے صدق وخلوص کی برکت سے ان کے لئے حقیقت اشیاء کو ہی بدل دیتے ہیں۔

علماء اسے بیان کرتے ہیں، بلکہ کتابوں میں بھی لکھ دیا ہے لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ صوفی اگر کسی عقبہ (گھاٹی) میں گرفتار ہو جائے تو اس سے نکلنے کے لئے یہ کیا ضروری ہے کہ خلاف سنت بلکہ خلاف شریعت عمل کرے۔ ایسے موقع پر بھی سنت ہی کا راستہ اختیار کرنا چاہئے۔ یہی راستہ روشن اور بے خطر ہے اور وہ راستہ یہی ہے کہ اس موقعہ پر اس کا استحضار رکھو کہ "**انا البائس الفقیر المستغیث المستجیر الخ**"، اس کو زبان سے کہو گے اور دل سے سمجھو گے تو کیا اس کے ذریعہ سے اس عقبہ سے نہیں نکل جاؤ گے، ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ اسے دل تک پہونچتے پہونچتے کچھ دیر لگ جائے، اور کچھ دنوں بعد یہ دل نشیں ہو مگر کرتے رہو انشاء اللہ اس عقبہ سے نکل جاؤ گے۔

تحقیق مفید

اب اس کے بعد آپ سے پوچھتا ہوں کہ کسی بڑے سے بڑے ولی کے لئے آخر یہ زیبا کب ہے کہ اس سے نکلنے کے لئے اس قسم کے خلاف شریعت امور کے ارتکاب کی ہمت کرے۔ بہرحال ہم کو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے توبہ کرنے کا طریقہ بتلا دیا ہے تو بس معصیت سے نکلنے کے لئے یہی کافی ہے، اور قرآن شریف کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ توبہ اول الاعمال ہے، ارشاد فرماتے ہیں اَلتَّـائِبُوْنَ الْعَـابِـدُوْنَ الْحَـامِدُوْنَ السَّـآئِحُوْنَ الرَّاكِعُوْنَ السَّاجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحَافِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ. ''وہ ایسے ہیں جو توبہ کرنے والے ہیں عبادت کرنے والے' حمد کرنے والے' روزہ رکھنے والے' رکوع اور سجدہ کرنے والے' نیک باتوں کی تعلیم کرنے والے اور بری باتوں سے باز رکھنے والے اور اللہ کے حدود کا خیال رکھنے والے اور ایسے مؤمنین کو آپ خوشخبری سنا دیجئے''۔

یہاں اللہ تعالیٰ مؤمنین مجاہدین کی جو صفات بیان فرما رہے ہیں ان میں سب سے پہلی صفت توبہ ہی کی بیان کی ہے، عبادت اس کے بعد ہے۔ اور جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خُلق قرآن تھا، آپ نے جب یہ دیکھا کہ صفت توبہ حق تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب ہے تو آپ اس وصف میں بھی سب سے آگے رہے۔ چنانچہ فرمایا ''وانا البائس الفقیر المستغیث المستجیر الوجل'' اور اس آگے ہونے کی وجہ یہ ہے کہ جتنے بھی کمالات ہوتے ہیں حضرات انبیاء علیہم السلام ان سب میں امتیوں سے بڑھے ہوئے ہیں۔ اس لئے جب اللہ تعالیٰ نے توبہ کی مدح فرمائی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کو بھی توبہ کرنے والوں کی صف میں سب سے آگے رکھا، اور حق استغفار ادا کر کے دکھلا دیا اور سب سے فائق

ہو گئے۔ توبہ اور استغفار ایک ہی چیز ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ توبہ دل میں ہوتی ہے اور استغفار زبان سے کہنے کا نام ہے۔ پھر جب توبہ اول الاعمال ہے تو ہر جگہ اول ہی رہے گی۔ یعنی اگر کافر مسلمان ہونا چاہے تو توبہ کرے اگر کوئی فاسق اہل صلاح میں سے ہونا چاہے تو توبہ کرے، کوئی صوفی طریق میں قدم رکھے تو اول توبہ کرے۔ غرض کافر و مشرک ہو یا مذنب ہو یا عابد و صوفی ہو یا ولی صدیق' ترقی کرنا چاہے تو توبہ کرے، پس ان میں سے جو بھی چاہے کہ ہماری ترقی ہو تو جب تک توبہ نہ کریں گے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ ہزار مجاہدہ ایک طرف اور توبہ ایک طرف اس کی وجہ سے اعمال پر سے نظر ساقط ہو جاتی ہے، کیونکہ آدمی جب کوئی عمل کرتا ہے تو تھوڑی بہت نظر اپنے عمل پر ہو ہی جاتی ہے۔ اسی لئے بزرگوں نے اس پر بہت زور دیا ہے اور شاہی دربار میں داخلہ کیلئے پہلی چیز توبہ کو قرار دیا ہے، کیونکہ انھوں نے معلوم کر لیا ہے کہ اس کو بارگاہ خداوندی میں دخل عظیم ہے اسی لئے اس کو لیا ہے اور نیاز مندی اختیار کی ہے ؎

زاہد غرور داشت سلامت نبرد راہ   رند از رہ نیاز بدار السلام رفت

یعنی زاہد اپنے غرور اور پندار کی وجہ سے راہ صحیح و سالم نہ طے کر سکا، اور آزاد راہ نیاز سے دار السلام میں داخل ہو گیا۔

سب علتوں کی علت نفس ہے

بات یہ ہے کہ سب علتوں کی علت نفس ہے جب یہ خراب ہو جاتا ہے تو ہر چیز کو خراب کر دیتا ہے۔ عبادت کیسی اچھی چیز ہے مگر جب نفس اس میں

شریک ہو جاتا ہے تو اس کو خراب کر دیتا ہے۔اسی لئے اس کو ختم کرنے کی اوراس کو توڑنے کی ضرورت ہے۔اور اسکو توڑنے کی سب سے عمدہ چیز استغفار ہے۔معلوم ہوا کہ اصل طریق یہی ہے ،آدمی توبہ واستغفار کرتا رہے۔اس لئے اس موقع پر اس شعر کو پڑھنے کا جی چاہتا ہے۔جو مولوی موسیٰ صاحب اکثر پڑھا کرتے تھے ؎

اب نہ ڈھونڈھیں گے ہرگز پتہ مل گیا ۔۔۔ جب نبی مل گیا تو خدا مل گیا

میں کہتا ہوں کہ جس طرح توبہ اول الاعمال ہے اسی طرح آخر الاعمال بھی ہے، کیونکہ قاعدہ ہے کہ جو چیز جہاں سے شروع ہوتی ہے وہیں ختم بھی ہوتی ہے۔چنانچہ کسی بزرگ سے پوچھا گیا کہ **ما النہایۃ**؟ انھوں نے جواب دیا کہ **العود الی البدایۃ** یعنی کسی نے ان سے پوچھا کہ طریق میں انتہا کس کا نام ہے؟ فرمایا کہ ابتدا کی جانب لوٹ جانا۔چنانچہ یہ توبہ حال ہی نہیں بلکہ مقام ہے،اوراعلیٰ مقام ہے۔اسی لئے تمام انبیاء اوراولیاء نے اسے لازم پکڑا ہے۔اہل اللہ جب اس مقام پر پہونچتے ہیں اوراپنے عجز وقصور کو دیکھتے ہیں تو توبہ واستغفار ان کے لازم حال ہوجاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے کچھ ہی دنوں پہلے سورۂ **اذا جآء نصر اللہ** نازل ہوئی،جس میں آپ کو تسبیح واستغفار کا ہی حکم تھا ’’**فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ وَاسْتَغْفِرْہُ اِنَّہٗ کَانَ تَوَّابًا**‘‘۔

اسی سنت پر عمل کرتے ہوئے بزرگان دین نے اپنے اپنے زمانہ میں ذکر وفکر،اعتراف ذنب،توبہ واستغفار اور نفی کمال ومراد کی ترغیب دی ہے۔

بزرگوں نے ذکر وشغل،توبہ واستغفار کا اہتمام فرمایا

چنانچہ مکتوبات معصومیہ میں ہے کہ ؎

حلقۂ ذکر را گرم دارند و بخلوت وتنہائی راغب باشند ودر شبانروزے یک دو وقت برائے عزلت معد باید ساخت ذکر وفکر وتذکر زلات وتقصیرات وتوبہ واستغفار ونفی وجود و سائر کمالات ونفی مرادات از خود دراں وقت از مغتنمات باید شمرد وباقی اوقات در افادہ واستفادہ صرف باید کرد۔ والسلام

(مکتوبات ص۲۲۷)

حلقۂ ذکر کا اہتمام اور اس پر دوام رکھیں اور تنہائی وخلوت میں رغبت اختیار کریں۔چنانچہ دن رات میں سے گھڑی دو گھڑی اس کے لئے نکالیں،اوراس وقت تنہائی میں رہیں، اور اس وقت میں ذکر وفکر کرنے اپنی کوتاہیوں اور لغزشوں کو یاد کرنے اور توبہ واستغفار کرنے اور اپنے وجود اور تمام کمالات اور اپنے سے تمامی مرادات کی نفی کرنے کو مغتنمات میں سے سمجھنا چاہئے، اور بقیہ اوقات کو افادہ واستفادہ میں صرف کرنا چاہئے۔

کیا ہی عمدہ نصیحت فرمائی ہے۔یعنی یہ کہ سالک کو چاہئے کہ کچھ وقت روزانہ نکال کر اس میں ذکر وفکر کیا کرے، اور توبہ واستغفار کرے، اور اپنی مرادات وکمالات کی نفی کیا کرے کہ عجب وخود پسندی وغیرہ سے نکلنے کا یہ مجرب طریقہ ہے۔اب یہ حال ہوگیا ہے کہ بزرگوں کی تعلیمات کی جانب

التفات نہیں ہے، محض ان کے بدن پر گرنا چاہتے ہیں، یعنی جسمانی قرب کو مقصود بنا رکھا ہے۔ اس میں خواجہ محمد معصومؒ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اس وقتِ خاص میں اپنے سے مرادات کی بھی نفی کرنی چاہئے، یہ اس لئے کہ مشائخ نے لکھا ہے کہ حق تعالیٰ سے فتوحات کا طلب کرنا عبودیت کے منافی ہے، بلکہ سوء ادبی ہے۔ چنانچہ ترصیع الجواہر میں ہے کہ اس کی وجہ سے بندہ جتنا پاتا ہے اس سے کہیں زیادہ فوت کر دیتا ہے، اور یہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے بندہ کو پیدا فرمایا اور اس دار دنیا کو دار تکلیف بنایا۔ چنانچہ کچھ چیزوں کے کرنے کا حکم دیا اور کچھ چیزوں سے منع فرمایا۔ اب اگر واقعی وہ بندہ ہے تو اس کا وظیفہ صرف یہی ہونا چاہئے کہ اوامر کا امتثال کرے اور اس پر توفیق کو اللہ تعالیٰ سے چاہے، اور اس پر لازم ہے کہ اپنے قلب کو تیار کرے کہ اس میں غیر اللہ کی ربانیت کو دخل نہ پانے دے، اور ان علائق کے قطع کرنے میں کوشش کرے جو اس کی عبودیت میں نقصان پیدا کرتے ہوں۔ یہی عبد و بندہ کے شایان شان ہے۔ باقی اعمال کے ثمرات کا طلب کرنا یہ کسی طرح مناسب نہیں کیونکہ نتائج کا معاملہ اللہ تعالیٰ کی طرف راجع (لوٹنے والا) ہے۔ وہ چاہیں تو دنیا ہی میں دیدیں یا چاہیں تو آخرت میں عطا فرمادیں، بندہ کو اس میں کوئی اختیار نہیں۔ اب اگر اس نے ثمرات کے طلب کرنے میں جلدی کی تو دو وجہوں سے اس نے بے ادبی کی۔ ایک تو یہ کہ اعمال پر ثمرہ کا مطالبہ کیا، دوسرے یہ کہ اس کا موطن یعنی دنیا کو تجویز کیا جو اس کی حقیقت کے بالکل خلاف ہے۔ (یعنی ثمرہ کا طلب کرنا آخرت میں ہونا چاہئے نہ کہ دنیا میں) یوں اگر اللہ تعالیٰ کسی کو کچھ

عطا فرمادیں تو ادب کے ساتھ بلا توقف اس کو قبول کر لینا چاہئے، اور نعمتوں پر اس اعتبار سے خوش ہو سکتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی رضامندی کی دلیل ہے باقی اس کی یہ حالت کہ نعمت پر خوش اور سلب نعمت پر ناخوش ہو یہ کسی طرح مناسب نہیں، اس لئے کہ بندہ کو مسلوب الارادہ ہونا چاہئے جیسا کہ کہا گیا ہے۔ ؎

مرادی منک نسیان المراد　　　اذا رمت السبیل الی الرشاد

ترجمہ: آپ سے میری مراد یہ ہے کہ اپنی مراد کو بھول جاؤں جب کہ میں رشد و ہدایت کے طریق کا قصد کروں۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کے بندے اللہ تعالیٰ سے ہر حال میں راضی ہی رہتے ہیں۔ دنیا اس پر وسیع ہو یا تنگ' کثرت عبادت کی توفیق دئے جائیں یا نہیں، اور یہ اس لئے کہ وہ نہیں جانتے کہ خیریت کس میں ہے۔

حضرت ابراہیم بن ادہمؒ نے فرمایا کہ ایک رات میں اپنے ورد سے سو گیا، جس کی وجہ سے مجھے تکدر ہوا، اور اس وقت میں اپنے اعمال پر اعتماد کرنے والوں میں تھا (دیکھا آپ نے شیخ کیا فرما رہے ہیں، فرماتے ہیں کہ اس وقت میں اپنے اعمال پر نظر کرتا تھا، چونکہ اخلاص تھا اس لئے اپنا کچا چٹھا سب بیان کر دیا، ورنہ تو اب کے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم لوگوں کا سلوک تمام ہو چکا ہے اور اب ہم سب لوگ ان عقبات سے گذر چکے ہیں اور کامل ہو چکے ہیں۔ حالانکہ بات یہ ہے کہ نہ تو عقبات سے نکلے ہو اور نہ ہی سلوک طے کئے ہو۔ بس حقیقت یہ ہے کہ طریق کو کچھ سمجھتے بوجھتے نہیں ہو اس لئے بہکی بہکی باتیں کرتے ہو۔ میں کہتا ہوں کہ کیا دنیا کے امور میں تو فہم کی ضرورت ہے اور اللہ تعالیٰ کے

طریق میں فہم کی ضرورت نہیں ہے۔اسی لئے ترقی نہیں ہورہی ہے اور راستہ بند
ہے۔آج فہم بڑھاؤ اور باتوں کو سمجھو تو کام بن جائے۔)
حضرت ابراہیم فرماتے ہیں کہ چونکہ مجھے ورد کے چھوٹ جانے سے تکدر
ہوا، اس لئے نیند کی وجہ سے چند فرائض کے چھوٹ جانے کی سزا دی گئی، اور
میرے باطن میں یہ ندا آئی کہ اے ابراہیم میرے بندے ہو جاؤ، راحت
پاجاؤ گے۔یعنی ہم سلا دیں تو سو جاؤ اور اگر کھڑا کردیں تو کھڑے ہو جاؤ
درمیان میں تمھیں کسی چیز کا اختیار نہیں ہے۔

بندے کو اپنی تجویز ختم کرنی ہوگی

بندے کو اپنی تجویز اور اپنی رائے اس لئے ختم کر دینا چاہئے کہ کبھی اللہ
تعالیٰ اس کو گناہ میں مبتلا فرماتے ہیں کہ وہ معصیت یا قلب میں ذلت اور
انکسار پیدا کرے جو اس طاعت سے کہیں بہتر ہے جو علو و استکبار کا سبب بنے۔
چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ بندہ گناہ کرتا ہے اور اس کی وجہ سے جنت
میں داخل ہو جاتا ہے۔مطلب یہ ہے کہ گناہ کے بعد جو توبہ و استغفار کرتا ہے،
اور انابت و اعتراف کرتا ہے اس کی وجہ سے اس کی مغفرت ہو جاتی ہے۔
کیونکہ وہ اس گناہ کی وجہ سے ہمیشہ غمگین، افسردہ، شکستہ دل، شرمسار اور سرنگوں
رہتا ہے، اور یہ سب چیزیں حسنات ہیں۔حاصل یہ کہ عبودیت کا مطلب یہ
ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اوامر کا امتثال اور نواہی سے اجتناب محض اللہ تعالیٰ کے
لئے کرے، اس میں کسی اور غرض کی آمیزش نہ ہو اور اللہ تعالیٰ سے ہر حال میں

راضی رہے اور اپنے لئے کوئی اختیار نہ ثابت کرے۔
فتح ربانی میں ہے کہ ایک شخص نے ایک غلام خریدا، اور اس سے پوچھا کہ
کیا کھانا چاہتے ہو؟ تو کہا جو آپ کھلائیں۔ پھر کہا کیا پہننا چاہتے ہو؟ عرض
کیا جو آپ پہنا دیں۔ پھر دریافت کیا کون سا کام کرنا چاہتے ہو؟ کہا جس
کا آپ حکم دیں۔ پھر سوال کیا کہاں رہنا چاہتے ہو؟ عرض کیا جہاں آپ امر
فرمادیں۔ یہ سن کر سید نے کہا تم تو عجیب آدمی ہو کہ تمہاری کوئی مراد ہی نہیں
ہے۔اس نے عرض کیا کہ اے میرے سید بھلا عبد کے لئے بھی اپنے مالک
کے سامنے کوئی مراد ہوا کرتی ہے۔ یہ سن کر مولا نے کہا اے کاش میں بھی اپنے
مالک حقیقی کے ساتھ ایسا ہی ہوتا جیسے کہ تم میرے ساتھ ہو۔ جاؤ تم کو اسی بات
پر آزاد کرتا ہوں، اور اب یہ چاہتا ہوں کہ تم میری جگہ بیٹھو اور میں تمہاری
خدمت کروں۔ اس لئے کہ تم میرے سید ہو تم نے مجھے بھولا ہوا سبق یاد
دلایا ہے۔اس لئے تم اس لائق ہو کہ میں تمہاری خدمت کروں۔

جزاک اللہ کہ چشمم باز کردی   مرا با جان جاں ہمراز کردی

اللہ تعالیٰ تجھ کو جزاء خیر دے کہ تم نے میری آنکھ کو کھول دیا اور مجھکو جان
جاناں (یعنی خدائے تعالیٰ) کا ہمراز کردیا۔
صاحب ترصیع نے یہ بات خوب بیان فرمائی ہے کہ کبھی اللہ تعالیٰ
معصیت کے ذریعہ اپنے بندے کی آزمائش کرتا ہے اور وہی معصیت اس
کے لئے توبہ وانابت (رجوع) کے بعد طاعت سے بہتر ہو جاتی ہے۔ چنانچہ
حدیث شریف میں آیا ہے کہ "**خیارکم کل مفتن تواب**،، یعنی تم

میں سے بہتر وہ شخص ہے جو فتنہ (معصیت) میں پڑ جانے کے بعد کثرت سے
توبہ کرے۔ ایسے شخص کو مفتون اس لئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ گناہوں کے ذریعہ
اس کا امتحان لیتے ہیں اور بار بار لیتے ہیں۔ چنانچہ اس سے گناہ صادر ہوتا ہے
اور توبہ کرتا ہے پھر گناہ کرتا ہے پھر توبہ کرتا ہے، اسی طرح لوٹتا پوٹتا راستہ طے
کرتا چلا جاتا ہے۔ بقول شخصے ؎

اس طرح طے کی ہیں ہم نے منزلیں　　گر پڑے گر کر اٹھے اٹھ کر چلے

بعض عارفین نے فرمایا ہے کہ اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے یہ خبر دی ہے کہ امت کے خیار (نیک) لوگ بھی زلل اور لغزش سے محفوظ
نہ ہونگے۔ بلکہ ان سے بھی گناہ ہوگا تا کہ اللہ تعالیٰ کی جانب توبہ واستغفار کے
ساتھ رجوع ہوں۔ یہ استغفار اور توبہ اللہ تعالیٰ کو نہایت پسند ہے، چونکہ یہ
معصیت پر موقوف ہے اس لئے ان حضرات سے بھی ان کا صدور ہو جاتا ہے
یہی مطلب ہے اس قول کا جو بعض بزرگوں سے منقول ہے۔ ”**رب ذنب
یکون للمؤمن انفع من کثیر من الطاعات من وجلہ وانابتہ**“ یعنی
بعضے گناہ ایسے ہیں جو مؤمن کے حق میں بہت سی طاعتوں سے بڑھکر نافع ہو
جاتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ اسکے ارتکاب کے بعد اللہ تعالیٰ کے خوف کو اپنے
دل میں لاتا ہے، اور اس کی جانب انابت کرتا ہے۔ جس کی وجہ سے کثرت
سے توبہ کرنے والا ہو جاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے یہاں یہ شخص محبوبین میں
سے ہو جاتا ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں کو پسند فرماتے ہیں اور
توبہ سے مراد یہاں وہ توبہ ہے جو قلب سے ہو نہ کہ صرف زبان سے ہو۔

علامہ حرالی کہتے ہیں کہ منجملہ نفس وشیطان کے وساوس کے یہ بھی ہے کہ وہ
گنہگار سے کہتا ہے کہ جب تک یہ نہ معلوم ہو جاوے کہ اب پھر اس گناہ کو نہ
کرو گے توبہ نہ کرنا کیونکہ ایسی توبہ سے کیا فائدہ جو ٹوٹ جائے۔ یہ شیطان کے
مکائد میں سے ہے اور انسان کی ہوائے نفس کے قبیل سے ہے۔ لہٰذا انسان کو
توبہ کی جانب سبقت کرنی چاہئے، پھر اگر توبہ ٹوٹ جائے تو مکرر توبہ کرے اس
لئے کہ اللہ تعالیٰ کو انسان کا یہ حال نہایت ہی پسند ہے، کیونکہ اسی کی وجہ سے اس
کی طاعات کا عجب ٹوٹتا ہے۔ اور رہی معصیت تو اس کو توبہ محو کر دیتی ہے،
بالآخر دونوں ہی کا خاتمہ ہو جاتا ہے یعنی نہ عجب ہی انسان میں رہ جاتا ہے اور
نہ گناہ ہی باقی رہتا ہے۔ یہ حق تعالیٰ کی تربیت ہے اس طریقہ سے جب وہ
پاک وصاف ہو جاتا ہے تو ظاہر ہے کہ خیار المحبوبین تو ہو ہی جائے گا۔ اس سے
معلوم ہوا کہ انسان جب طاعت کرتا ہے تو اس کی وجہ سے ضرور کچھ عجب پیدا
ہو جاتا ہے جس سے اس کو نکالنا ضروری ہوتا ہے۔ اور طاعت کا عجب جاتا نہیں
جب تک کہ انسان اپنے کو مبتلائے معصیت دیکھ نہیں لیتا۔ پس اس معصیت
کے عیب سے اس عجب کے عیب کا تو خاتمہ ہی ہو جاتا ہے۔ اب رہ گئی معصیت
تو اس کے ازالہ کیلئے حق تعالیٰ نے توبہ کو مشروع کیا۔ چنانچہ انسان جب
صدق دل سے توبہ کرتا ہے اور اس کے قلب میں خوف اور انابت کی صفت پیدا
ہو جاتی ہے تو وہ گناہ بھی معاف ہو جاتا ہے، اسی چیز نے اولیاء اللہ کی کمر توڑ دی
ہے، یعنی یہ حضرات چاہتے ہیں کہ گناہ سرزد نہ ہو مگر اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں کہ
طاعت پر ان کی نظر نہ ہو، اس لئے گناہ کا صدور ان سے بھی ہو جاتا ہے، اور گو

ان حضرات کوانابت الی اللہ طاعت میں بھی نصیب ہوتی ہے مگراس میں خوف
نہیں ہوتا اس لئے انسان عجب وغیرہ میں مبتلا ہوجاتا ہے برخلاف اس انابت
کے جو اہل معاصی کوارتکاب معصیت کے بعد پیدا ہوتی ہے کہ اس میں خوف
بھی ہوتا ہے اسی لئے یہ انابت اس انابت سے بڑھکر ہوتی ہے اور واقعی انسان
ایسی طاعت کرے جس سے یہ سمجھتا ہو کہ میں اللہ تعالیٰ کا حق ادا کررہا ہوں اور
پھراس کی وجہ سے اس کے قلب میں خوف پیدا ہوجائے یہ بہت مشکل کام
ہے۔ کیونکہ طاعت کی وجہ سے اس کوایک کیف وسرور حاصل ہوتا ہے، جس
کا نتیجہ عجب وپندار تو ہوسکتا ہے باقی خوف نہیں ہوا کرتا، الا ماشاء اللہ۔ اسی وجہ
سے یہ عابد درجہ میں اس گنہگار سے کم ہوجاتا ہے، نہ اس وجہ سے کہ اس نے
عبادت کی، بلکہ اس وجہ سے کہ اس کے ساتھ رذیلہ عجب کوبھی شامل کرلیا۔

اسی طرح سے جو گنہگار کہ انابت اور خوف کے ساتھ متصف ہو وہ درجہ
میں عابد سے بڑھ جاتا ہے، نہ اس وجہ سے کہ اس نے معصیت کی ہے بلکہ اس
لئے کہ اس کے بعد اس نے خوف اور انابت جیسی باطنی طاعت بھی کی ہے،
اس نے اسکا درجہ بڑھا دیا۔ آج ہماری ایمانی ترقی جو نہیں ہورہی ہے تو اسی
لئے کہ ہم اپنے باطن سے غافل ہیں، اور پہلے لوگوں نے جو ترقی کی ہے تو اس
لئے کہ ان کی نظر اپنے باطنی اعمال پر بھی ہوتی تھی، اور باطنی عمل کا یہ حال ہوتا
ہے کہ لوگ تو اس کو عمل سے عاری سمجھتے ہیں اور وہ اندر اندر کام کرتا رہتا ہے۔
مثلاً یہی خوف اور انابت ہی ہے کہ یہ جس کے قلب میں جاگزیں ہوجائیگی تو
اس کو چین نہ لینے دے گی۔ اللہ تعالیٰ کے خوف سے اپنے قلب وجگر کو اس شخص

نے خون کر دیا۔ مگر کسی دوسرے شخص کو اسکی اطلاع بھی نہیں ہوئی۔ چنانچہ
مومن کے قلب میں خوف ورجا ہر وقت موجود ہوتی ہے۔ اور اسی کی وجہ سے وہ
اپنے دماغی توازن کوٹھیک رکھتا ہے۔ اگر طاعات سے عجب کا کچھ خیال ہوا تو
خوف کو اپنے پیش نظر کرلیتا ہے، اور اگر خوف ویاس کا غلبہ ہوا تو رجاء کو
مدنظر کرلیتا ہے۔ اسی لئے آپ نے سنا ہوگا کہ ”**الایمان بین الخوف
والرجاء**“ یعنی ایمان نام ہی اس کا ہے کہ انسان امید وبیم (خوف) کے
مابین رہے۔ مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ کی وعیدوں کا اس کو خوف لگا ہو، اور وعدے
سے رجاء قائم ہو۔ اللہ تعالیٰ نے جنت کا وعدہ بھی کیا ہے اور دوزخ کا ذکر
کرکے وعید بھی سنائی ہے۔ اسی لئے مومن کا دونوں پر ایمان ہوتا ہے اور اس
کے قلب میں یہ دونوں صفتیں موجود ہوتی ہیں۔

حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ جو بہت زبردست عالم تھے اور حضرت
مولانا فضلِ رحمٰنؒ کے خلیفہ بھی تھے ان سے کسی نے دریافت کیا کہ مولانا
مزاج کیسا ہے؟ فرمایا کہ بھائی مومن کا کیا مزاج پوچھتے ہو۔ دنیا میں تو وہ بین
الخوف والرجاء رہتا ہے۔ اور جو شخص خوف ورجا کے درمیان ہو اسکا مزاج ہی
کیا ہے۔ مزاج کا حال تو اس وقت بیان کیا جاسکتا ہے جب دخول جنت کی
بشارت سن لیں۔

سبحان اللہ! کیسا عمدہ عالمانہ اور صوفیانہ جواب دیا۔ علماء نے اس جواب
کو بہت پسند فرمایا ہے۔ غرض مومن کے قلب میں خوف ورجاء کی صفت برابر
ہی موجود رہتی ہے۔ آج بمبئی سے ایک شخص کا خط آیا ہے، یہاں سے جانے

کے بعد اپنے تأثرات کو ایک شعر میں ادا کیا ہے وہ یہ ہے ؎

بے رونقی جمود تعطل سکوتِ مرگ — ایسا ہے کائنات کا نقشہ ترے بغیر

یہ انھوں نے لکھا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ بھائی جس قلب میں خوف ورجا متمکن ہو اور باہم دونوں متلاطم بھی ہوں یعنی کبھی یہ غالب ہو اور کبھی وہ غالب ہو اس میں بھلا سکون وسکوت کہاں؟

بہر حال کلام طویل ہو گیا۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ خوف اور رجا یہ دونوں قلب کی صفات ہیں اور باطنی اعمال ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ایک شخص اس باطنی عمل سے متصف ہو گو بظاہر طاعت وغیرہ میں اس کی کمی ہو یا معصیت ہی میں کیوں نہ مبتلا ہو برخلاف اس کے کہ ایک شخص ایسا ہوتا ہے کہ ظاہری طاعات تو اس کے پاس بہت ہوتی ہیں مگر ان باطنی اعمال سے وہ کورا ہوتا ہے بلکہ بجائے اس کے دوسرے باطنی رذائل میں مبتلا ہوتا ہے۔ چنانچہ جب ان دونوں کا مقابلہ ہو جاتا ہے تو یہ باطنی معصیت ہی ظاہری طاعت پر غالب آجاتی ہے۔ اور جیسا کہ عابد ناپارسا اور گنہگار کے واقعہ میں مفصل بیان کیا جا چکا ہے کہ اس گنہگار کی رجا وانابت کام آگئی۔ اور عابد کی ریائی عبادت کا اس کے عجب وپندار نے ناس کر دیا اور گنہگار سے رجا اسلئے پسندیدہ ہے کہ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ نے اس کا امر فرمایا ہے۔

سب سے زیادہ رجاء والی آیت

چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰی اَنْفُسِهِمْ

لَاتَقْنَطُوْا مِن رَّحْمَةِ اللّٰهِ" آپ کہہ دیجئے کہ اے میرے بندو جنھوں نے اپنے اوپر زیادتیاں کی ہیں کہ تم اللہ تعالی کی رحمت سے ناامید مت ہو"۔

اس میں قنوط یعنی ناامیدی سے نہی فرمائی ہے، جس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہوا کہ رجا کا امر فرمایا گیا، کیونکہ قاعدہ ہے کہ ایک چیز سے نہی اس کی ضد کا امر ہوتا ہے اور کسی چیز کا امر اس کے خلاف سے نہی ہوا کرتی ہے۔ چنانچہ یہ اللہ تعالیٰ کا کس قدر فضل عظیم ہے کہ گنہگار کو امید رکھنے کا امر فرمایا اور ناامیدی سے منع فرمایا۔ چنانچہ علماء فرماتے ہیں کہ جس طرح اللہ تعالیٰ سے نڈر اور بے خوف ہو جانا کفر ہے اسی طرح اس کی رحمت سے ناامید ہونا بھی کفر ہے۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ "ناامیدی راخدا گردن زدہ است"۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے ناامیدی کی گردن ہی ماردی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مشائخ نے اس آیت کو ارجیٰ (سب سے زیادہ امید والی) آیت فرمایا ہے۔ مکتوبات معصومیہ میں اس کے متعلق نہایت ہی عمدہ کلام فرمایا ہے۔ اس کو ہم یہاں نقل کرتے ہیں لیکن اس سے پہلے ایک اور سوال وجواب نقل کیا ہے جو خالی از لطف نہیں ہم پہلے اس کو ہی درج کرتے ہیں۔

نوشتہ بودند کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والبرکات در مقام رضا بودہ اند پس آیت کریمہ ولسوف یعطیک ربک فترضیٰ بچہ معنی است۔ مخدوما رضا بر	آپ نے تحریر فرمایا تھا کہ حضرات انبیاء علیہم الصلوۃ والبرکات تو مقام رضا میں ہوتے ہیں۔ پس اس آیت کریمہ "ولسوف یعطیک ربک فترضیٰ" یعنی آپ کا رب آپ

دوگونہ است۔ رضائیست پیش از وجود عطیہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والبرکات امروز ایں رضا حاصل است۔ عطیہ وعدم ونعمت ونقمت دریں رضا مستوی است ہرچہ ازاں طرف می رسد وقضائے ازل براں رفتہ است بآں راضی اند ورضائیست بعد وجود عطیہ و پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم در روز قیامت چوں عطیات و انعامات بیشمار شود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم فرمائند بس است من راضی شدم۔

کو اس قدر دیگا کہ آپ راضی ہو جائیں گے ، اس کا کیا مطلب ہے؟ مخدوم من! رضا کی دو قسمیں ہیں، ایک تو وہ رضا ہے جو انعام کے وجود سے پہلے ہوتی ہے، چنانچہ حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والبرکات کو یہ رضا ہر وقت حاصل ہوتی ہے۔ عطیہ کا ملنا نہ ملنا نعمت ہو یا نقمت اس رضا میں یکساں ہیں، یعنی جو چیز کہ ان کی جانب سے پہونچی اور جس پر قضا جاری ہو چکی ہے، یہ حضرات اس پر دل سے راضی ہیں، اور ایک درجہ رضا کا یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قیامت میں جب بیشمار انعامات اور عطایا کا مشاہدہ کریں گے تو فرماویں گے کہ پروردگار بس بس میں راضی ہو گیا۔

اب اسکے بعد وہ کلام نقل کرتا ہوں جس کو میں بیان کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ:۔

ازامام محمد باقر منقول است کہ گفت اہل عراق شامی گوئید کہ ارجیٰ آیت در قرآن شریف لَاتَقْنَطُوْا مِن رَّحْمَۃِ اللّٰہِ است وما اہل بیت برانیم کہ امید در آیت وَلَسَوْفَ یُعْطِیْکَ رَبُّکَ فَتَرْضٰی بیشتر است چہ حضرت رسالت صلی اللہ علیہ وسلم راضی نہ شود کہ یکے از امت او در دوزخ باشد گویم کہ میتو اند کہ ارجی آیت نسبت بعامۃ الخلق آیت اولیٰ بود وارجیٰ بنسبت بایں امت ثانیہ بود۔

(مکتوبات معصومیہ ص ۲۲۲ جلد ثالث)

حضرت امام محمد باقر سے منقول ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ تم اہل عراق یہ کہتے ہو کہ قرآن مجید میں سب سے زیادہ امید والی آیت لَاتَقْنَطُوْا مِن رَّحْمَۃِ اللّٰہِ ہے اور ہم اہل بیت اس کے قائل ہیں کہ آیت وَلَسَوْفَ یُعْطِیْکَ رَبُّکَ فَتَرْضٰی میں زیادہ امید ہے، اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت تک راضی ہی نہ ہوں گے جب تک کہ آپ کا ایک امتی بھی دوزخ میں ہوگا۔ میں کہتا ہوں کہ تطبیق اس طرح ہو سکتی ہے کہ عام مخلوق کے اعتبار سے زیادہ امید والی آیت اول (لَاتَقْنَطُوْا مِن رَّحْمَۃِ اللّٰہِ) ہے اور اس امت محمدیہ کے اعتبار سے آیت ثانی (وَلَسَوْفَ یُعْطِیْکَ رَبُّکَ فَتَرْضٰی) ہے۔

دیکھا آپ نے یہاں اس امر میں اختلاف ہو گیا کہ آیت ارجیٰ (زیادہ امید والی) کون سی ہے کسی نے لَاتَقْنَطُوْا مِن رَّحْمَۃِ اللّٰہِ کو کہا اور کسی نے وَلَسَوْفَ یُعْطِیْکَ رَبُّکَ فَتَرْضٰی کو کہا، اور شیخ نے کیسی عمدہ تطبیق فرمائی کہ لَاتَقْنَطُوْا مِن رَّحْمَۃِ اللّٰہِ تو عام لوگوں کے لئے ہے، یعنی تمام امتوں کے

لئے اور وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى خاص اس امت کے لئے ہے۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ارشاد فرما رہے ہیں کہ آپ گھبرائیں نہیں۔ عنقریب اللہ تعالیٰ آپ کو بکثرت نعمتیں دیگا اتنی کہ آپ اس سے خوش ہو جائیں گے۔ پس یہ آیت ارجیٰ آیت اس لئے ہوئی کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو راضی فرما دینے کا گویا وعدہ فرمایا ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ اگر آپ کی امت کا ایک فرد بھی جہنم میں ہوگا تو آپ کیونکر راضی ہو جائیں گے، اس لئے کہ آپ کو اپنی امت کے ساتھ غایت درجہ کی محبت وعنایت ہے۔ پس آپ کا راضی ہو جانا آپ کی شان کرم سے بعید ہے۔ اسی مضمون کو کسی نے خوب ادا کیا ہے ؎

الم یر ضک الرحمٰن فی سورۃ الضحیٰ
فحاشاک ان ترضیٰ وفینا معذّب

یعنی کیا آپ کو رحمٰن نے سورۃ الضحیٰ میں راضی کرنے کا وعدہ نہیں فرمایا ہے تو آپ سے بعید ہے کہ راضی ہو جائیں اگر ہم میں سے ایک فرد بھی جہنم کے عذاب میں مبتلاء ہو۔

سبحان اللہ! کیا ہی خوب مضمون ہے جو علماء کے لئے نہایت بصیرت افروز اور ساری امت کے لئے تسلی بخش ہے۔

سب سے زیادہ خوف والی آیت

اب آپ کو ایک اور آیت سناتا ہوں۔ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں یٰاَیُّهَا

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَاتَأْكُلُوا الرِّبٰوا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ "اے ایمان والو! سود مت کھاؤ کئی حصے زائد اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو امید ہے کہ تم کامیاب ہو جاؤ"۔

اس آیت کے متعلق روح المعانی میں ہے کہ امام اعظمؒ فرماتے ہیں کہ یہ تمام قرآن میں سے اخوف (زیادہ خوف والی) آیت ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے مومنین کو سود کے لینے پر اس نار کی دھمکی دی ہے جو کافرین کے لئے تیار کی گئی ہے وہ اس میں داخل ہوں گے۔ جبکہ وہ محارم سے اجتناب نہ کریں جس طرح سے کہ لَاتَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ارجیٰ آیت ہے۔ اسی طرح یہ اخوف آیت ہے۔ ارجیٰ کو پا کر تو آپ لوگ بہت خوش ہوئے اخوف کو تو بھی لیجئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن شریف میں خوف ورجا دونوں کا ذکر ہے لیکن ہم قرآن شریف برابر پڑھتے ہیں اور یہ خبر نہیں کہ قرآن شریف کو بھی سلوک وتصوف میں کچھ دخل ہے یا نہیں۔ رجا اور خوف یہ دونوں قلب کی صفات ہیں۔ لہٰذا علماء کسی آیت کے متعلق یہ جو فرماتے ہیں کہ یہ ارجیٰ آیت ہے یا فلاں اخوف آیت ہے تو اسکا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جب ان آیتوں پر سے گذر و تو قلب میں بھی یہی کیفیت موجود ہونی چاہئے، کیونکہ اگر قلب میں ان مضامین کا کچھ بھی اثر نہ ہوا تو ان کا ارجیٰ یا اخوف ہونا ہمارے کس کام کا۔

تلاوت کے وقت قلب کو حاضر رکھے

اس لئے مومن کو چاہئے کہ علی العموم تلاوت کے وقت قلب کو حاضر رکھے

اور یہ سمجھنے کی کوشش کرے کہ میں کیا پڑھ رہا ہوں اور کس کا کلام پڑھ رہا ہوں۔ بالخصوص اس قسم کی آیت پر سے گذرے تو اپنی توجہ اور التفات کو قوی کرے اور دلی قصد وارادہ کے ساتھ ان آیات کو زبان سے پڑھے اور سعی اس بات کی کرے کہ قلب بھی ان کے مضامین اور اثرات سے متاثر ہو۔

چنانچہ اگر ایک بار کے پڑھنے میں یہ کیفیت قلب میں نہ محسوس کرے تو مکرر وسہ کرر پڑھے، اور جب تک اس کیفیت کا کچھ حصہ نصیب نہ ہو جائے آگے نہ بڑھے۔ چنانچہ آگے فرماتے ہیں کہ **وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ** " اور دوڑو مغفرت کی طرف بھی جو تمہارے پروردگار کی طرف سے ہو، اور جنت کی طرف جس کی وسعت ایسی ہے جیسے سب آسمان اور زمین، وہ تیار کی گئی ہے اللہ سے ڈرنے والوں کے لئے"۔

ایک صاحب جو انگریزی دانوں کے نزدیک مسلم شخص تھے، وہ کہتے تھے کہ حضرت ہاجرہؓ کو صفا و مروہ کے درمیان دوڑا کر اللہ تعالیٰ نے سب کو قیامت تک کے لئے دوڑا دیا (یعنی حج میں سعی کو واجب قرار دیا) میں نے کہا کہ آپ نے وہ تو دیکھا اور اس کو نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے کلام پاک میں آیت "**وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ** الخ" نازل فرما کر سب کو مغفرت اور جنت کی طرف دوڑا دیا، اور یہاں مراد اس کے اسباب ہیں یعنی اعمال صالحہ۔ حضرت علیؓ سے منقول ہے کہ ادائے فرض کی طرف سبقت کرو۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اسلام کی طرف۔ ابوالعالیہؒ کہتے ہیں کہ ہجرت کی طرف۔ انس

ابن مالکؓ کہتے ہیں کہ نماز کی تکبیر اولیٰ کی طرف۔ سعیدؒ ابن جبیرؓ کا ارشاد ہے کہ ادائے طاعت کی طرف۔ حضرت یمانؒ سے منقول ہے کہ صلوٰۃ خمسہ کی طرف۔ ضحاکؒ کہتے ہیں کہ جہاد کی طرف۔ حضرت عکرمہؒ کہتے ہیں کہ توبہ کی طرف۔ مگر ظاہر یہ ہے کہ تمام ہی معنی مراد ہیں، جس میں سارے اعمال صالحہ داخل ہیں۔ اور آیت میں مغفرت کی تقدیم جنت پر اس لئے کی گئی کہ مغفرت میں تخلیہ (خالی کرنا) ہے اور جنت میں تحلیہ (آراستہ کرنا) اور تحلیہ سے تخلیہ مقدم ہوتا ہے۔ یا اس لئے کہ مغفرت ہی سبب دخول جنت کا ہوگا۔ اور اس موقع پر رب کا لفظ استعمال فرمانا اور اس کو مخاطبین کی جانب مضاف کرنا ان کے اوپر مزید لطف وکرم کے اظہار کے لئے ہے۔ اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ ایک مرتبہ صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ بنی اسرائیل ہم سے زیادہ خدا کے نزدیک مکرم ہیں، اس لئے کہ ان میں کوئی شخص جب گناہ کرتا تھا تو اس حال میں صبح کرتا تھا کہ اس کا گناہ اور اس کی سزا اس کے دروازے پر لکھ دیا جاتا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ سن کر خاموش ہو گئے۔ چنانچہ یہ آیت نازل ہوئی جس کا آخری حصہ یہ ہے کہ **وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ وَمَن يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ** " اور ایسے لوگ کہ جب کوئی ایسا کام کر گزرتے ہیں جس میں زیادتی ہو، یا اپنی ذات پر نقصان اٹھاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کو یاد کر لیتے ہیں، پھر اپنے گناہوں کی معافی چاہنے لگتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے سوا اور ہے کون جو گناہوں کو بخشتا ہو، اور وہ لوگ اپنے فعل پر اصرار

نہیں کرتے اور وہ جانتے ہیں''۔

اس آیت کے متعلق یہ بھی روایت میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو شخصوں میں مواخاۃ (بھائی چارگی) فرمادی چنانچہ وہ دونوں ہمیشہ ساتھ ساتھ رہتے تھے ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان میں سے ایک شخص غزوہ میں چلا گیا اور دوسرے کو اپنے اہل خانہ اور اپنی ضرورت خانہ داری پر محافظ بنایا گیا اس سے اپنے ساتھی کی عدم موجودگی میں کوئی گناہ صغیرہ ہوگیا، اس پر وہ جنگلوں اور پہاڑوں میں مارا مارا پھرتا تھا اور اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہ سے توبہ کرتا تھا یہاں تک کہ اس کا ساتھی واپس آیا اور اس کی تلاش میں نکلا دیکھا تو ایک جگہ وہ سجدے میں پڑا ہوا ہے اور کہہ رہا ہے ''ربی ذنبی ربی ذنبی'' یعنی اے رب میں نے بڑے گناہ کا کام کیا اور اپنے بھائی کی امانت میں خیانت کی اس نے اسے اٹھایا اور کہا کہ چلو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اور مغفرت کے لئے دعا کی درخواست کرو شاید کہ اللہ تعالیٰ کشادگی فرمادیں۔ چنانچہ ادھر وہ مدینہ منورہ حاضر ہوا۔ نماز عصر کا وقت تھا ادھر جبرئیل علیہ السلام اس کی توبہ لیکر حاضر ہوئے یعنی یہ آیت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سنائی۔ وَالَّذِيْنَ اِذَافَعَلُوْا فَاحِشَةً..... الیٰ. وَنِعْمَ اَجْرُ الْعَامِلِيْنَ،، اس پر حضرت عمرؓ بولے کہ یارسول اللہ کیا اسی کے لئے خاص ہے یا سب کے لئے عام ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں سب کے لئے عام ہے۔ روایت میں آتا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو ابلیس نے اپنے لشکر کو بلایا اور اپنے سر پر مٹی اڑانے لگا اور ویل وثبور پکارنے لگا۔

یہاں تک کہ ہر طرف سے اس کے لشکری آگئے سب نے اس سے پوچھا کہ اے ہمارے سید یہ آپ کا کیا حال ہے اس نے کہا کہ کچھ نہ پوچھو کتاب اللہ میں ایک ایسی آیت نازل ہوگئی ہے کہ اب اس کے بعد کسی بنی آدم کو کوئی گناہ بھی مضر نہ ہوگا۔ ان سب نے پوچھا کہ وہ کون سی آیت ہے اس نے یہی آیت بتلائی۔ ان سب نے کہا حضور پریشان نہ ہوں ہم ان لوگوں کے لئے خواہشات کا دروازہ کھولدیں گے۔ پس نہ تو کوئی توبہ کرے گا نہ استغفار ہی کرے گا اور جو کام بھی کریں گے تو یہی سمجھیں گے کہ ہم حق پر ہیں۔ یہ سن کر ابلیس خوش ہوگیا اور اس سے اس کے کچھ آنسو پونچھ گئے۔

میرے نزدیک ارجیٰ آیت یہ ہے

میں کہتا ہوں کہ علماء نے اس کے متعلق یہ نہیں فرمایا کہ یہ آیت ارجیٰ (زیادہ امید والی) ہے لیکن آیت کے شان نزول اور اس کے مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ ابلیس پر سب سے زیادہ شاق یہی آیت ہوئی۔ اور گنہگاروں کے لئے کس قدر تسلی اور عنایت ہے کہ وہ گناہ کرنے کے بعد اگر اللہ تعالیٰ سے توبہ واستغفار کرلیں تو پھر ایسے ہوجائیں گے کہ گویا انھوں نے گناہ کیا ہی نہیں۔ چنانچہ ''وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ،، کے عنوان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مذنبین کے لئے بجز حق تعالیٰ کے فضل وکرم کے اور کوئی جائے پناہ نہیں ہے اور یہ اس لئے کہ جو ذات ایسی ہو کہ اس کی رحمت ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہو تو ظاہر ہے کہ کرم وفضل کے نشر میں اس کا کوئی ہم پلہ نہیں ہوسکتا۔ نیز یہ آیت ارجیٰ یوں ہے کہ بندہ جب حق تعالیٰ کی

ایسی عنایت دیکھے گا اور توبہ کی اس قدر اہمیت دیکھے گا تو توبہ کی طرف اس کے میلان میں حرکت وتقویت ہوگی تو پھر وہ توبہ سے صبر ہی نہ کر سکے گا۔

نیز بطور استغراق کے جو بیان کیا گیا تو اس سے مقصود یاس اور قنوط کا قلع قمع کرنا ہے۔ چنانچہ ایک دوسرے مقام پر ”لَاتَقْنَطُوْا مِن رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعاً،، میں قنوط سے صراحۃً منع فرمادیا گیا ہے، جس کی وجہ سے اللہ والوں کو مغفرت کی امید لگانے کا ایک ذریعہ ہاتھ آ گیا۔ چنانچہ بزرگوں نے اسی کے حوالہ سے دعائیں کی ہیں۔ حضرت شیخ فریدالدین عطاءؒ فرماتے ہیں۔

مغفرت دارم امید از لطف تو
زانکہ خود فرمودۂ لاتقنطوا

یعنی آپ کے لطف وکرم سے امید مغفرت کی اس لئے رکھتا ہوں کہ آپ نے خود ہی لَاتَقْنَطُوْا مِن رَّحْمَةِ اللّٰهِ فرمایا ہے۔ اب اس حکم کے بعد یاس وناامیدی تو کفر ہی ہے۔

اسی طرح میں کہتا ہوں کہ جس طرح ”اُعِدَّتْ لِلْكَافِرِيْنَ ،، کے متعلق امام صاحب نے یہ فرمایا کہ مسلمانوں کے لئے اخوف آیت ہے تو آگے ”اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ“ جو فرمایا ہے اس کے متعلق قرینۂ مقابلہ سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ ارجیٰ آیت ہے مجھے تو اس وقت یہاں یہ بیان کرنا تھا کہ یہ آیتیں بھی ارجیٰ آیتیں ہیں، لیکن جب مضمون سامنے آ گیا ہے تو اس آیت کی تفسیر بھی سن لیجئے کیونکہ اس میں مکارم اخلاق کا بیان ہے۔

مکارم اخلاق کا بیان

جب یہ فرمایا کہ جنت متقیوں کے لئے تیار کی گئی ہے تو آگے یہ بیان فرماتے ہیں کہ متقی کون لوگ ہیں۔ یہاں ان کے تین اوصاف بیان فرمائے ”اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِى السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ“ اور” وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ اور وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ“ ۔یعنی ان کی ایک صفت انفاق ہے، خواہ حالت عسر (تنگی) کی ہو یا یسر (کشادگی) کی، حال سرور کا ہو یا غم کا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ زندگی میں بھی خرچ کرتے ہیں اور مرنے کے بعد بھی بشکل وصیت خرچ کرتے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان مقامات پر بھی خرچ کرتے ہیں جہاں ان کو خرچ کرنا اچھا معلوم ہوتا ہے یعنی اولاد واعزہ اور اقارب پر اور ان مقامات پر بھی خرچ کرتے ہیں جہاں خرچ کرنا ان کو کھلتا ہے مثلا اپنے دشمنوں پر۔ حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ انھوں نے ایک دانہ انگور کا بھی صدقہ کیا ہے۔ بعض سلف سے منقول ہے کہ ان کے پاس ایک پوٹی پیاز کی تھی اس کو بھی انھوں نے صدقہ کر دیا۔ حدیث شریف میں ہے ”اتقوا النار ولو بشق تمرة“ (یعنی بچو جہنم کی آگ سے اگرچہ کھجور کا ایک ٹکڑا ہی ہو) اور یہ بھی آتا ہے کہ سائل کو کچھ نہ کچھ ضرور دو، اگرچہ جلی ہوئی کھری ہی کیوں نہ ہو۔

اب کظم غیظ کے متعلق سنئے: کظم کے معنی ہیں بھر جانے پر مشک کا منہ بند کر دینا، اور غیظ کہتے ہیں کسی منکر امر کو دیکھ کر طبیعت میں ہیجان کا پیدا ہو جانا۔ غیظ میں اور غضب میں فرق یہ ہے کہ غضب کے بعد انتقام کا ارادہ ضرور

پیدا ہوجاتا ہے اور غیظ میں یہ ضروری نہیں ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ غضب وہ
ہے جسکا اثر بلا اختیار جوارح بشرہ پر ظاہر ہو، اور غیظ میں ایسا نہیں ہوتا۔

حدیث شریف میں ہے کہ جس نے کظم غیظ کیا اور وہ اس کے نافذ کرنے
پر قادر تھا تو اللہ تعالیٰ اس کے قلب کو امن وامان سے بھر دیگا۔ نیز رسول اللہ صلی
اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے کظم غیظ کیا اور وہ اس کے جاری کرنے پر
قادر تھا تو قیامت میں اللہ تعالیٰ اس کو سب لوگوں کے سامنے طلب فرمائیں گے
اور اختیار دیں گے کہ جس حور کو چاہے لیلے۔ دیکھئے کظم غیظ کی اتنی فضیلت آئی
ہے، اور کتنے کتنے اجر کا وعدہ کیا گیا ہے مگر دیکھتا ہوں کہ آج جس قدر عملداری
غصہ کی ہے اتنی اور کسی چیز کی نہیں ہے۔ ہر شخص اس کی وجہ سے بادشاہ بنا ہوا
ہے۔ کہتے ہیں کہ اس میں اتنا مزہ ہے کہ عمدہ عمدہ کھانوں میں بھی نہیں ہے۔

ف: اس قسم کا حضرت مصلح الامتؒ کا خاص طرز کلام تھا جو مخاطبین کے لئے
نہایت مفید و مؤثر ثابت ہوتا تھا۔ (قمر الزمان)

اب عفو کے متعلق سنئے: متقی وہ لوگ ہیں جو لوگوں کو معاف کرتے ہیں ان
لوگوں کو سزا دینے سے جو مستحق مواخذہ ہوتے ہیں، جبکہ اس کو معاف کرنے
میں دینی نقصان نہ ہو۔ حضرت حسن سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت میں
ارشاد فرمائیں گے کہ جس شخص کا اللہ پر اجر ہو وہ کھڑا ہوجائے تو کوئی شخص نہ
کھڑا ہوگا بجز اسکے جس نے دنیا میں معاف کیا ہوگا۔

نیز حدیث شریف میں ہے کہ جس کو یہ بات پسند ہو کہ اس کے لئے
مکانات تعمیر کئے جائیں اور اس کے درجات بلند ہوں تو چاہئے کہ وہ اپنے

او پر ظلم کرنے والے کو معاف کردے۔ اور جو اسے محروم کرے اس کو دے اور
جو قطع رحمی کرے اس کے ساتھ صلہ رحمی کرے۔ سبحان اللہ یہ صفات تھیں
متقیوں کی۔ اب جو ہمیں ترقی نہیں ہورہی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ علم صحیح
نہیں ہے۔ چنانچہ آپ کو بھی دین کا علم نہیں ہے اب کس کو غرض پڑی ہے کہ وہ
آپ کی خاطر دردسر مول لے، اور آپ کو دین کا علم سکھلائے۔ میں تو کہتا
ہوں کہ خود آپ کو بھی اس کی غرض نہیں پڑی ہے۔ یعنی آپ کو بھی علم دین
حاصل کرنے کی فکر نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے متقیوں کے لئے جنت کو تیار فرمایا
ہے اور آپ ہیں کہ اس کو یاد بھی نہیں کرتے، کتنی بے حسی کی بات ہے۔

العیاذ باللہ تعالیٰ

خوف ورجاء کی بحث

خیر یہ گفتگو تو ضمناً آ گئی تھی میں اصل میں خوف ورجا پر کلام کر رہا ہوں اور
الحمد للہ ایک حد تک اس پر مفصل کلام ہو گیا۔ چنانچہ آپ کو معلوم ہے کہ یہ قلب
کی صفات ہیں اور ظاہر ہے کہ جس قلب میں خوف ورجا موجود ہوں تو وہ
انسان تو اپنے ہی متعلق اندیشہ میں پڑ جائے گا۔ اس کو دوسروں کی برائی دیکھنے
کی فرصت ہی کب ملے گی۔ یہی وجہ ہے کہ عابد کا قلب ان صفات سے خالی
ہوتا ہے تو اس کی نظر اپنی طاعت پر پڑتی ہے اور دوسروں کے گناہ پر، پھر اس
کی وجہ سے اس میں عجب وتکبر پیدا ہوتا ہے اور کبھی کبھی وہ دوسروں کو کچھ
جزرو توبیخ کرتا ہے اور گنہگار فاسق کو دیکھ کر چیں بجبیں ہوتا ہے۔ پس منشاء تو

اس کا ہوتا ہے کبر باطن اور وہ اس کو سمجھتا ہے غضب للہ۔ اس میں شک نہیں کہ ان دونوں میں التباس شدید ہے۔

یہیں سے اس اشکال کا جواب بھی سمجھ میں آ گیا جو اس مقام پر ہوسکتا ہے وہ یہ کہ فساق وفجار اور کفار سے تو بغض رکھنے کا شریعت میں حکم ہے۔ چنانچہ اس کے متعلق مکتوبات معصومیہ میں ہے کہ:

"افسوس صوفیائے خام اس زمانہ کے ملحدین کفار سے موالات میں باک نہیں رکھتے اور یہ کہتے ہیں کہ فقیری کا راستہ کسی سے برا نہ بننا ہے۔ سبحان اللہ سرور انبیاء اور رئیس الاولیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو تو یہ حکم دیا گیا کہ "یَا اَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْکُفَّارَ وَالْمُنَافِقِیْنَ" اور آپ کا طریقہ مرضیہ (پسندیدہ) تو غلظت (سختی) اور قتال با کفار تھا۔ عجب قسم کے فقراء ہیں کہ پیغمبر علیہ السلام کا راستہ چھوڑے ہوئے ہیں، حالانکہ آپ کے طریقہ کو چھوڑنے کے بعد سوائے گمراہی اور ضلالت کے کیا رہ جاتا ہے۔ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلَالَ، بلاشبہ کفار اعداء اللہ ہیں نص قطعی اس پر ہے۔ عجیب بات ہے کہ ایک طرف تو اللہ سے دوستی کا دعویٰ ہے اور دوسری جانب ان کے دشمنوں سے بھی دوستی۔ اگر کفار وفساق اعداء حق اور عنداللہ مبغوض نہ ہوتے تو بغض فی اللہ واجبات دین میں سے نہ ہوتا اور افضل مقربات اور مکمل ایمان نہ قرار پاتا اور ولایت کے حصول کا سبب اور قرب حق اور رضائے باری تعالیٰ کا ذریعہ نہ بنتا"۔

حدیث شریف میں ہے۔

عن عمرو بن الجموح انه سمع النبی صلی الله علیه وسلم لایحق العبد حق صریح الایمان حتی یحب لله ویبغض لله فاذا احب لله تبارک وتعالیٰ وابغض لله تعالیٰ تبارک فقد استحق الولاء من الله.

(رواه احمد)

حضرت عمرو بن جموح کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے، فرماتے تھے کہ بندہ صریح ایمان کا حق نہیں ادا کرتا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے لئے حب اور بغض کرنے لگے۔ چنانچہ جب وہ اللہ تعالیٰ کے لئے محبت اور اللہ تعالیٰ کے لئے بغض کرتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی جانب سے بھی محبت کئے جانے کا مستحق ہو جاتا ہے۔

وعن ابی امامة قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم من احب لله وابغض لله واعطیٰ لله ومنع لله فقد استکمل الایمان.

(رواه ابوداؤد - مشکوة ج ۱)

حضرت ابو امامہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے اللہ کے واسطے محبت کی اور اللہ کے واسطے بغض رکھا اور اللہ کے واسطے دیا اور اللہ کے واسطے روکا اس نے ایمان کی تکمیل کرلی۔

وہم در حدیث آمده است تقربوا الی الله سبحانه ببغض اهل المعاصی

نیز حدیث شریف میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرو اہل معاصی سے بغض کرکے اور ان سے

والتمسوا رضآء الله تعالیٰ بسخطهم وتقربوا الیٰ الله عزوجل بالتباعد منهم.

ترش روئی کے ساتھ ملو اور اللہ تعالیٰ کی رضا ان لوگوں کی ناراضگی میں حاصل کرو اور اللہ تعالیٰ کا قرب ان سے دوری میں تلاش کرو۔

وہم در حدیث آمده است اوحیٰ الله تعالیٰ الی نبی من الانبیاء قل لفلان العبد امازهدک فی الدنیا فتعجلت راحة نفسک واماانقطاعک الی فتعززت بی فماذا عملت فی مالی علیک قال یارب وماذا علی قال هل عادیت عدوا وهل رأیت لی ولیا.

(مکتوبات معصومیہ)

نیز حدیث شریف میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سابق انبیاء میں سے کسی نبی کی جانب وحی بھیجی کہ فلاں عابد سے کہہ دو کہ تیرا یہ دنیا سے زہد تو اس لئے ہے کہ (کسب کی مشقت سے) تیرا نفس راحت پا گیا۔اور رہا میری جانب تیرا انقطاع تو تو نے میری وجہ سے عزت بھی تو پائی یہ بتلا کہ میرا جو تجھ پر حق تھا اس کو تو نے کتنا ادا کیا؟ اس نے عرض کیا کہ اے رب مجھ پر کون سا تیرا حق تھا (جسکو میں نے ادا نہیں کیا) ارشاد ہوا کہ میرے لئے کبھی کسی دشمن سے دشمنی رکھی؟ اور میری خاطر کبھی کسی ولی کی زیارت کو تو گیا۔

آگے فرماتے ہیں کہ:

والحق که محبت دوستان محبوب وعداوت دشمنان او از لوازم محبت است، محبّ صادق دریں دو عمل محتاج کسب وتعمل نیست چنانکه در اعمال دیگر محتاج است۔ دوستان دوست چه بلا زیبا به نظر درآئند ودشمنان او چه قدر زشت ایں معنی در مجاز ظاهر است هر که دعوے دوستی نماید تاتبری از دشمنان اونکند مقبول نیست ازمنافق بیش نمی دانند۔

(مکتوبات معصومیہ)

حق یہ ہے کہ محبوب کے دوستوں سے محبت اور اس کے دشمنوں سے عداوت بھی محبت کے لوازم سے ہے۔محبّ صادق ان دونوں کاموں میں عمل اور کسب کا محتاج نہیں ہے (مطلب یہ کہ) جس طرح سے دیگر اعمال میں (جب کسی کام کو باختیار خود کرتا ہے تب ہی وہ ہوتا ہے لیکن یہاں محبوب کے دوست سے محبت اور دشمنوں سے عداوت اضطراری طور سے ہوتی ہے، واقعی دوست کے احباب بھی محبّ کی نظروں میں کس قدر خوبصورت اور اس کے اعداء کس قدر بدصورت معلوم ہوتے ہیں اس کا اندازہ اہل مجاز کے معاملات سے بھی عیاں ہے۔(وہ یہ کہ) مثلا جو شخص کسی سے دوستی کا دم بھرے تو جب تک کہ اس کے دشمنوں سے بیزاری نہ ظاہر کر دے اس کا دعویٰ مقبول نہیں ہے بلکہ منافق لوگوں سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہیں۔

دیکھئے! کس قدر زور دار کلام فرمایا ہے۔ اس امر کے ثبوت کے لئے کہ فاسق فاجر اور کافر سے بغض رکھنا ہی علامت ایمان ہے اور ان سے ترش رو چہرہ کے ساتھ ہی ملنا چاہئے۔ اور اللہ تعالیٰ کا قرب ان سے دوری اختیار کرنے میں ہے۔ اشکال یہ ہوتا ہے کہ اگر یہ صحیح ہے اور یقیناً صحیح ہے جیسا کہ حدیث شریف سے معلوم ہوا تو پھر اس عابد نے اس گنہگار کو جو بہ نظر حقارت اور ترش رو چہرہ کے ساتھ دیکھا تھا تو کیا برا کیا تھا۔ حالانکہ شیخ نے اس کا جو یہ حال بیان کیا ہے کہ ۔

دراں نیمہ عابد سر پر غرور ترش کردہ بر فاسق ابرو زدور

اس طرف سے مغرور عابد فاسق پر دور سے منہ چڑھائے ہوئے تھا۔ یہ کچھ بطور مدح کے نہیں بیان کیا ہے۔

جواب یہ ہے کہ دونوں باتیں صحیح ہیں۔ مکتوبات معصومیہ میں جو روایات مذکور ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ فاسق و فاجر سے بغض رکھنا چاہئے۔ یہ بھی صحیح ہے لیکن حدیث شریف کے الفاظ یہ ہیں کہ **من ابغض لله** جس سے یہ معلوم ہوا کہ بغض جو مطلوب و محمود ہے وہ ہے جو اللہ کے لئے ہے، اپنے نفس کیلئے نہ ہو، اور یہاں اس عابد پر جو نکیر کی گئی تو اس لئے کہ اس نے جو کچھ کیا تھا اپنے نفس کیلئے کیا تھا، اس میں وہ مخلص نہیں تھا۔ مخلص کا کچھ انداز ہی جدا ہوتا ہے اس کے غضب میں بھی نور ہوتا ہے۔ وہ گناہ کو برا سمجھتا ہے مگر گنہگار کی ذات کو حقیر نہیں سمجھتا بلکہ اپنے ہی اوپر خائف رہتا ہے کہ معلوم نہیں میرا کیا حال ہو، اس کی گفتگو میں کبر اور عجب کی شان نہیں ہوتی۔ چنانچہ اس عابد

ناپارسا کا یہ حال نہیں تھا بلکہ وہ اپنے کو کامل سمجھ رہا تھا اور تھا کچھ نہیں، اور باتیں اپنے متعلق ایسی کر رہا تھا جس سے پتہ چلتا تھا کہ کاملین کی فہرست میں خود کو داخل کرنا چاہتا ہے۔ یہ بہت برا ہے بغض فی اللہ کا درجہ حاصل کرنا ہر ایک کا کام نہیں۔ یہ تو نقالی ہوئی اور نیک لوگوں کی شباہت اختیار کرنا ہوا، اور ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ یعنی اس میں کہ ایک وہ شخص ہو جو واقعی کامل ہو اور ایک وہ جو کمال کا دعویٰ کرتا ہو۔

مولانا رومؒ نے اپنی مثنوی میں اس مسئلہ کو ایک مثال کے ذریعہ خوب ہی سمجھایا ہے۔ چنانچہ شغال رنگین کا واقعہ لکھا ہے کہ ایک گیدڑ رنگ کے مٹکے میں گر گیا، نکلا تو رنگین تھا۔ اس نے اپنے ہم جنسوں کے سامنے یہ دعویٰ کیا کہ میں مور ہو گیا ہوں اور اس پر اپنے ظاہری رنگ کو دلیل بنایا کہ میرا بدن دیکھو اور اپنا بدن دیکھو۔ دوسرے گیدڑوں کو اس کا یہ دعویٰ برا تو معلوم ہوا لیکن ظاہری فرق کا کوئی جواب بھی نہ تھا اس لئے خاموش ہو گئے۔ ایک پرانا گیدڑ آگے بڑھا اور اس نے کہا کہ تم یہ دعویٰ کرتے ہو کہ تم مور ہو گئے ہو اچھا مور تو ناچتا ہے اور بولی بھی بولتا ہے۔ تم بھی ناچو اور بولی بولو۔ چنانچہ وہ بولا تو گیدڑ کی سی بولی جس سے سب پر اس کا گیدڑ ہونا ظاہر ہو گیا۔ مولانا فرماتے ہیں کہ اسی طرح سے بعضے لوگ اپنے ظاہر کو رنگ لیتے ہیں اور دعویٰ کمال کا کرتے ہیں لیکن امتحان ان کو رسوا کر دیتا ہے۔ ظاہر کو رنگنے سے کام نہیں چلے گا اندر کو رنگنا چاہئے، اور اندر کا رنگ جانتے ہیں کیا ہے؟ صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً وَنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ. بزرگوں نے فرمایا ہے کہ رقص محبت ہے اور

بولی معرفت ہے او پر او پر سے تو اپنے کو رنگ سکتے ہو لیکن نہ رقص کر سکتے ہو اور نہ معرفت کی باتیں ہی بیان کر سکتے ہو۔

غرض میں یہ کہہ رہا ہوں کہ بغض فی اللہ بھی کوئی چیز ہے مگر کوئی اس کے ساتھ متصف بھی تو ہو وہ دوسرے قسم کے لوگ تھے جن کے یہ اوصاف تھے اب ویسا ہونا بہت مشکل ہے، ہاں دعویٰ اور نقالی البتہ آسان ہے۔ چنانچہ عابد ناپارسا کی حکایت میں اس عابد کے بغض پر جو انکار کیا گیا اور شیخ سعدیؒ نے اس کو پسند نہیں فرمایا تو اسی لئے کہ وہ نقال اور ریا کار تھا کبر کا شکار تھا، کیونکہ اس نے جو جو الفاظ اس گنہگار کے متعلق کہے تھے مثلاً یہ کہ مدبر (بدبخت) کہا اور یہ کہا کہ مسیح علیہ السلام سے اس کو کیا تعلق ہے اور یہ کہا کہ ایسوں کے لئے دوزخ کے دروازہ کے کھولنے کی بھی ضرورت نہیں ہے (بلکہ پہلے سے ہی کھلا ہوا ہے) تو یہ سب اس کا خالص تکبر تھا۔ اور حدیث شریف میں جس بغض کا ذکر ہے اور حضرات صحابہ جو معاملہ کیا کرتے تھے وہ غایت اخلاص اور للّٰہیت سے کرتے تھے ان دونوں میں کوئی نسبت ہی نہیں۔ صورۃً دونوں یکساں معلوم ہوتے ہیں مگر حقیقت میں دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ بغض فی اللہ کا شرعاً حکم ہے اور انسان اس کو تواضع کے ساتھ جمع کر سکتا ہے یعنی یہ ہو سکتا ہے کہ انسان بغض فی اللہ بھی کرے اور عین اسی حالت میں غایت درجہ کا متواضع بھی ہو برخلاف اس بغض وغصہ کے جس کا منشاء کبر باطن ہو کہ اس میں تواضع اصلاً باقی نہیں رہتی۔

حب فی اللہ و بغض فی اللہ کی بحث

امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں اس مسئلہ پر نہایت ہی محققانہ کلام فرمایا ہے جس کو ہم یہاں بعینہ نقل کرتے ہیں، فرماتے ہیں کہ:

’’اگر تم کہو کہ میرے لئے یہ بھلا کس طرح ممکن ہے کہ کسی مبتدع یا فاسق سے بغض فی اللہ بھی رکھوں کیونکہ ہم کو ان سے بغض رکھنے کا حکم دیا گیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ان سے تواضع سے بھی پیش آؤں اس لئے کہ ان دونوں کا جمع کرنا جمع بین المتناقضین (یعنی دو متضاد چیزوں کا جمع کرنا) سا ہے۔

اس کے جواب میں امامؒ فرماتے ہیں کہ بیشک تمہارا یہ خیال صحیح ہے اور صرف تم ہی نہیں بلکہ بہت سے لوگوں پر یہ امر مشتبہ رہا ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ بدعت اور فسق پر انکار کے وقت غضب للہ، کبر نفس اور علم وتقویٰ پر ناز کے ساتھ مختلط ہو جاتا ہے یعنی صورۃ چونکہ دونوں چیزیں یکساں ہیں اس لئے ان میں باہم اشتباہ واقع ہو جاتا ہے‘‘۔

میں کہتا ہوں کہ امام غزالیؒ کی یہ بات آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔
اس فرق کو اگر ناقصین سمجھ لیں اور اپنا معمول بنالیں تو کامل ہو جائیں۔

آگے فرماتے ہیں کہ:

’’چنانچہ بہت سے عابد جاہل اور عالم مغرور جب کسی فاسق کو اپنے پہلو میں بیٹھا ہوا دیکھتے ہیں تو اس کو دھتکار دیتے ہیں، اور اپنے

کبر باطن کے سبب سے اس سے اس طرح نفرت اور دوری کا اظہار کرتے ہیں جیسے کہ کوئی نجاست وغیرہ سے اپنے دامن کو بچاتا ہو، اور لطف یہ کہ سمجھتے یہ ہیں کہ ہمارا یہ غصہ اللہ کے واسطے ہے۔ جیسا کہ بنی اسرائیل کے ایک عابد نے اپنے ایک رفیق کے ساتھ اسی قسم کا معاملہ کیا تھا۔ امام کی مراد اس سے وہی عابد ناپارسا ہے کہ جس کا واقعہ شیخ سعدیؒ نے بوستاں میں نقل کیا ہے''۔

میں کہتا ہوں کہ عابد جاہل اور عالم مغرور سے جو چیزیں صادر ہوتی ہیں وہ اس لئے کہ یہ لوگ عبادت وغیرہ کرنے کی وجہ سے علم وزہد میں تو کچھ ترقی کر لیتے ہیں مگر اخلاق کی بلندی پر فائز نہیں ہوتے، بلکہ اس کے اعتبار سے پستی میں ہی رہتے ہیں اس لئے ان کو اپنی اخلاقی کمزوری مثلاً یہ کہ نفس میں کبر موجود ہے یا اپنے علم وورع پر ان کو ناز پیدا ہوگیا ہے۔ یہ سب باتیں ان کی سمجھ میں ہی نہیں آتیں۔ اب اگر یہ لوگ اخلاقی بلندی حاصل کریں مثلاً تواضع جو کہ سب سے بڑا خلق بلکہ تمام اخلاق محمودہ کی اصل ہے اس کو سمجھنے اور اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ تب اپنی خامیاں اور کمزوریاں ان کو محسوس ہوں گی۔ یعنی جب خلق تواضع کی خوبی سے متصف ہوجائیں گے، اور اب اس وقت نفس میں بگاڑ پیدا ہوکر اگر کبر آئے گا تو یہ فوراً اس کو محسوس کرلیں گے اور غضب للہ اور غضب للنفس میں ان کو تمیز حاصل ہوجائے گی جیسا کہ صالحین امت کو ہر زمانہ میں ہوئی ہے۔ چنانچہ اس کی کچھ مثالیں ہم آئندہ بیان کریں گے۔

آگے امام صاحبؒ فرماتے ہیں کہ:

''فاسق پر کبر اور غضب، بغض فی اللہ کے مشابہ اس لئے ہوتا ہے کہ مطیع پر کبر کا شر ہونا تو ظاہر ہے اور اس سے بچنا بھی ممکن ہے۔ مگر فاسق اور مبتدع پر کبر کرنا اور اس پر غصہ ہونا اس کو تو اچھا ہی سمجھا جاتا ہے کیونکہ بغض فی اللہ کے مشابہ ہوتا ہے اور بغض فی اللہ محمود ہے۔ نیز غضب اور تکبر دونوں لازم وملزوم ہیں بھی کیونکہ غصہ والا جس پر غصہ کرتا ہے اس سے گویا تکبر ہی کے ساتھ پیش آتا ہے اور تکبر کرنے والا غصہ ضرور کرتا ہے۔ غرض دونوں لازم وملزوم اور باہم ملے جلے اور صورۃً ایک دوسرے کے مشابہ ہوتے ہیں''۔

میں کہتا ہوں کہ امام نے یہ جو فرمایا کہ مطیع پر کبر کا شر ہونا ظاہر ہے تو یہ امام اپنے زمانہ کا حال بیان فرماتے ہوں گے، تاہم اس سے اتنا تو معلوم ہوا کہ مطیعین پر بھی کبر کیا جاتا ہے مگر وہ ہوتا ہے شر اور مذموم اور اس سے بچنا بھی ممکن ہوتا ہے۔ لیکن اس زمانہ میں تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ لوگ یوں تو باہم خوب ملے جلے رہتے ہیں لیکن کوئی شخص اگر ان میں اور صالح ہوتا ہے تو اسی پر انکار کیا جاتا ہے بلکہ اس کو افضل العبادات سمجھا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ علماء اور مشائخ جو کہ دین حاصل ہونے کے ذرائع تھے جب انھیں سے کبر کیا جائیگا اور ان کو حقیر سمجھا جائیگا تو پھر حصول دین کی سبیل ہی کیا باقی رہ جاتی ہے۔ چنانچہ اس کا انجام ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ دین سے تعلق ختم ہی ہوتا چلا جارہا ہے اس لئے کہ لوگ اہل دین سے بے نیاز ہوگئے ہیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ.

آگے امام صاحب فرماتے ہیں:

''چونکہ ان دونوں میں التباس شدید ہے اس لئے ان میں تمیز
وہی کرسکتا ہے جو موفّق من اللہ ہو (یعنی جس شخص کو اس کے اخلاص
کے سبب سے من جانب اللہ ایک ذوق وتمیز عطا ہوئی ہو جس سے
بروقت وہ دونوں میں فرق کرلیتا ہو''۔)

میں کہتا ہوں کہ امام صاحب کے اس ارشاد سے معلوم ہوا کہ جو موفق من
اللہ ہوتا ہے اسے غضب للہ اور غضب للنفس میں تمیز حاصل ہوتی ہے لہذا
ضرورت ہے کہ لوگ ایسی چیزوں کو اختیار کریں جن کی وجہ سے قلب میں امتیاز
کا ملکہ پیدا ہو جائے تا کہ جب غضب للہ میں نفس شامل ہونے لگے تو فوراً اس
کا احساس ہو جائے۔ امام نے جو کچھ فرمایا اس کا حاصل یہ ہے کہ جس طرح
عبادت میں خلوص کی ضرورت ہے یعنی یہ کہ وہ غیر اللہ کی آمیزش سے خالی ہو۔
چنانچہ یہی وجہ ہے کہ شرعاً ریا کی ممانعت ہے اور اخلاص کا حکم ہے کہ اس کے
بغیر اللہ تعالیٰ کے یہاں عبادت مقبول نہیں ہوتی۔ اسی طرح سے یہ بھی سمجھنا
ضروری ہوگا کہ تعلیم وتربیت کا سلسلہ بھی عند اللہ اسی پر موقوف ہے اور اسی
قاعدہ پر یہ بھی مرتب ہے کیونکہ بدعت اور فسق پر انکار بھی دین ہی ہے بلکہ اعظم
خدمت دین ہے۔ تو اس میں بھی اخلاص کی ضرورت ہوگی یہ بھی بدون اخلاص
کے مقبول نہ ہوگی اور اخلاص بدون آمیزش نفس سے خالی ہوئے نہیں ہوسکتا۔
چنانچہ جب بدعت یا فسق کے انکار میں کبر یا علم وورع پر ناز ہو جایا کرتا ہے تو
ایسے ناپاک مرض کے ہوتے ہوئے یہ انکار عند اللہ کیسے دین ہوسکتا ہے۔
بدعت اور فسق کے انکار کا منشاء غضب للہ ہوتا ہے جیسا کہ اکابر امت سے

ثابت ہے۔ باقی غضب للنفس کا شمول بھی اس میں ہو جاتا ہے یہ بھی انھیں
اکابر کی تصریحات سے معلوم ہوا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ان حضرات نے غضب
للنفس کو ترک کیا ہے۔ جس طرح سے کہ غضب للہ کو اللہ کیلئے عمل میں لائے
ہیں۔ یہ دونوں قسمیں انھیں بزرگوں کے طرز عمل سے ثابت ہوئیں ورنہ غضب
للنفس کو اگر یہ حضرات اپنے عمل میں نہ بیان فرماتے تو یہی باقی رہتا اور اس پر
گمان غضب للہ کا کیا جاتا۔ اسی طرح غضب للہ دنیا سے رخصت ہی ہو جاتا۔

غضب للہ فرض ہے اور غضب للنفس حرام ہے

غرض غضب للہ جس طرح فرض ہے اسی طرح غضب للنفس حرام ہے۔
امام غزالیؒ کی غضب للہ اور غضب للنفس کی یہ تفریق تمام عابدوں اور علماء پر
حجت ہے۔ لہٰذا ان کو یہ سمجھنا ہوگا کہ امام نے جس کی مذمت بیان فرمائی ہے
کہیں ہم تو اس میں داخل نہیں ہیں۔

چونکہ غضب للہ اور غضب للنفس میں التباس اور اشتباہ واقع ہو جاتا ہے
لہٰذا ان دونوں میں باہم امتیاز کرنا ضروری ہے۔ اب جو شخص اس میں تمیز رکھتا
ہو اس کے لئے تو معاملہ بالکل آسان ہے، لیکن جو ابھی ناقص ہے یعنی تمیز
سے عاری ہے اسے اس موقع پر کیا کرنا چاہئے۔ اس کے متعلق تو امام غزالیؒ یہ
فرماتے ہیں کہ:

اس خلط اور التباس سے خلاصی کی یہ صورت ہے کہ جب تم کسی فاسق یا
مبتدع کو دیکھو یا انھیں امر بالمعروف یا نہی عن المنکر کرو تو اس وقت تین باتوں

کا استحضار رکھو۔

''ایک تو یہ کہ اپنی توجہ اپنے سابقہ معاصی پر رکھو تا کہ تمہارا مرتبہ خود تمہاری نگاہوں میں کمتر معلوم ہو اور تمہارا نفس ہی تم کو ذلیل جانے۔

دوسری بات یہ کہ تم کو جو فاسق یا مبتدع پر فوقیت حاصل ہے خواہ علم میں یا اعتقاد حق میں یا عمل صالح میں تو یہ سمجھو کہ یہ سب چیزیں حق تعالیٰ کی عطایا ہیں اور اسی کا فضل ہے، تمہارا اس میں کچھ کمال نہیں۔ جب اس بات کا لحاظ رکھو گے تو پھر تمہیں عجب نہ ہوگا اور جب عجب نہ ہوگا تو تکبر بھی نہ ہوگا۔

تیسری بات یہ کہ تمہارا اور اس شخص کا انجام جو کہ سر دست ایک امر مبہم ہے اس کے متعلق کم از کم یہ اندیشہ رکھو کہ شاید تمہارا خاتمہ اچھا نہ ہو (العیاذ باللہ) اور اس کا اچھا ہو جائے۔ جب اس امر کا تصور رکھو گے تو اس کی وجہ سے تمہارے اندر خوف پیدا ہوگا اور پھر وہ تمہیں تکبر سے باز رکھے گا، اب اگر تم یہ کہو کہ ان امور کی وجہ سے خوف جو طاری ہوگا تو اس کی وجہ سے کبر نفس تو بلا شبہ ختم ہو جائے گا مگر ساتھ ہی ساتھ غصہ کا بھی تو خاتمہ ہو جائیگا پھر غضب للہ کی کیا سبیل ہوگی؟ تو میں کہوں گا کہ نہیں اگر تمہارا سید تمہیں غصہ کرنے کا حکم دے تو تم اس کے لئے غصہ کر سکتے ہو اور تمہارا یہ غصہ یقیناً اپنے نفس کیلئے نہ ہوگا اس لئے کہ اس وقت تم اپنے غصہ کرنے میں اپنے کو نجات پانے والا اور اپنے صاحب کو ہلاک ہونے والا نہیں سمجھو گے بلکہ تمہیں تو خود اپنا ہی خوف لگا ہوگا کیونکہ تم یہ

سمجھتے ہو گے کہ گو بظاہر یہ شخص گنہگار ہے لیکن مخفی اور باطنی گناہ میرے اس سے کہیں زیادہ ہیں اور پھر خاتمہ کا بھی حال معلوم نہیں تو کس بناء پر دوسرے کو حقیر سمجھا جائے۔ (حاصل یہ کہ اس طور سے تواضع اور غضب کو باہم جمع کیا جا سکتا ہے)

اب ہم تمہیں ایک مثال کے ذریعہ اس کو واضح کرتے ہیں کہ غضب للہ کیلئے ضروری نہیں ہے کہ انسان مغضوب علیہ پر تکبر بھی کرے اور اپنے آپ کو اس سے بڑا ہی جانے۔ دیکھو کسی بادشاہ کا کوئی غلام ہو اور ایک لڑکا بھی ہو جو کہ اس کا لخت جگر اور نور نظر ہو۔ اور اس نے اپنے لڑکے کو غلام کی تربیت میں دیدیا ہو اور اسے حکم فرمایا ہو کہ جب یہ کوئی بے ادبی کرے یا کوئی نازیبا حرکت اس سے سرزد ہو تو اس کو ڈانٹے۔ تنبیہ کرے اور اگر ضرورت پڑے تو مارے بھی اب اگر یہ غلام اپنے مالک کا محبّ اور فرماں بردار غلام ہوگا تو لڑکے کی بے ادبی پر اس کے لئے مارنے اور تنبیہ کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہ ہوگا۔ چنانچہ اب یہ جو اس پر غصہ کرے گا تو محض اپنے مالک کے خاطر کریگا اور اس سے اس کا مقصد امتثال امر کر کے قرب حاصل کرنا اور مولا کی مرضی کا پورا کرنا ہوگا۔ نیز اس لئے ہوگا کہ اس لڑکے سے اس کے مالک کی مرضی کا پورا کرنا ہوگا۔

نیز اس لئے ہوگا کہ اس لڑکے سے اس کے مالک کی مرضی کے خلاف کا صدور ہوا ہے۔ لہٰذا وہ اس پر غصہ تو کرے گا مگر اس پر ذرا تکبر نہیں کرے گا بلکہ اس حال میں بھی متواضع ہی رہیگا۔ کیونکہ اس کے

پیش نظر اپنی حیثیت بھی ہے اور لڑکے کا مرتبہ بھی۔ وہ یہ کہ لڑکا بہر حال غلام سے اعلیٰ و افضل ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ غصہ کے لئے تکبر اور عدم تواضع ضروری نہیں۔ پس اس طرح سے ممکن ہے کہ مبتدع اور فاسق پر تم نکیر بھی کرو اور اپنے دل میں یہ سمجھتے ہو کہ شاید اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہی تم سے افضل ہو، کیونکہ یہ ہوسکتا ہے کہ ازل میں اس کے لئے حسن القضاء (اچھا فیصلہ) اور تمھارے لئے سوء القضاء (برا فیصلہ) ثابت ہو چکی ہو اور تمہیں اس کی خبر نہ ہو۔ لہٰذا اب اس حال میں تم جو اس پر غصہ کرو گے تو محض مالک کے حکم کی خاطر، اور اپنے مولا کی محبت کی وجہ سے اور اس لئے کہ اس لڑکے سے مولا کی مرضی کے خلاف کام ہوا ہے۔ پس اس وقت اس کے ساتھ تواضع بھی قائم رہے گی، کیونکہ تم یہ سمجھے ہوئے ہو کہ ہوسکتا ہے کہ کل کو قیامت میں اس کا مرتبہ تم سے بڑھا ہوا ہو اس کے بعد پھر تکبر کہاں باقی رہ سکتا ہے۔

چنانچہ علماء میں سے جو اہل فہم وبصیرت ہیں وہ اسی طرح سے تواضع اور خوف کو جمع کرلیا کرتے ہیں، اور جو مغرور (یعنی دھوکہ میں پڑے ہوئے) ہیں ان کا حال یہ ہے کہ ایک طرف تکبر بھی کریں گے اور پھر اپنے لئے دوسروں سے زائد اجر وثواب کے بھی خواہشمند ہونگے۔ حالانکہ انجام کی کچھ خبر نہیں اور ظاہر ہے کہ اس سے بڑھ کر دھوکہ کی چیز اور کیا ہوسکتی ہے۔ غرض یہ طریقہ ہے عاصی اور مبتدع کے ساتھ تواضع اور بغض فی اللہ کے جمع کرنے کا اور خود کو کمتر سمجھتے ہوئے

بھی فاسق اور مبتدع سے کنارہ کشی اختیار کرنے کا جو کہ مطلوب شرعی ہے''۔ (انتھیٰ کلامہ، احیاء العلوم ص ۳۷۰ جلد ۳)

رفق کی فضیلت کی وجہ

میں کہتا ہوں کہ امام نے جو خلاصی کی سبیل بیان فرمائی صحیح ہے۔ لیکن ایک مخصوص طبقہ ہی اس پر عمل کرسکتا ہے۔ ہر شخص کے لئے اس طریقہ پر عمل کرنا آسان نہیں، اس لئے امام ہی کی برکت سے بلکہ انھیں کے کلام سے مستنبط کرکے اس کا آسان حکم بیان کرتا ہوں وہ یہ کہ امام نے رفق کی فضیلت بیان کرتے ہوئے باب کے آخر میں لکھا ہے کہ ابی عون انصاریؒ سے منقول ہے کہ کسی شخص نے کوئی سخت کلمہ اپنی زبان سے نہیں نکالا مگر یہ اس کے قائم مقام کوئی نرم کلمہ بھی ضرور ہوتا ہے جسے وہ اس کی جگہ استعمال کرسکتا تھا۔

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ تمام اہل علم رفق اور نرمی کی مدح جو فرما رہے ہیں تو اسی لئے کہ نرمی اکثر احوال اور اغلب مواقع میں مفید ہی ہوتی ہے اور سختی کی جانب حاجت شاذ ونادر ہی پڑا کرتی ہے۔ اور کامل وہ شخص ہے جس کو رفق وعنف (سختی) کے مواقع کی تمیز پیدا ہوگئی ہو اور وہ ہر شخص کو اس کا حق دے سکتا ہو۔ لیکن اگر وہ ناقص البصیرت ہو اور کسی خاص واقعہ کا حکم اس پر پوشیدہ رہ جائے یعنی وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ یہاں پر سختی کرنی چاہئے یا نرمی تو اسے نرمی ہی اختیار کرنی چاہئے۔ اس لئے کہ اس میں کامیابی زیادہ ہے۔

(احیاء العلوم ص ۱۸۶ ج ۳)

کامل وناقص کا حکم

ناقص وکامل کا یہ حکم جو امام نے بیان فرمایا وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں رفق وعنف اختیار کرنے سے متعلق تھا، پس اسی پر قیاس کر کے ہم یہاں بھی کہہ سکتے ہیں کہ جو شخص کامل ہو یعنی اس کو امتیاز حاصل ہو، وہ تو بدعت اور فسق پر انکار کرسکتا ہے، کیونکہ اسے تمیز ہے کہ یہ غضب للہ ہے لیکن جو شخص ناقص ہو یعنی یہ تمیز نہ رکھتا ہو اس کے لئے متعین ہے کہ زبان سے ان پر انکار نہ کرے کہ یہ انکار منجر بہ کبر (کبر کی طرف لے جانے والا) ہوگا۔ یہ بغض فی اللہ ہے ہی نہیں۔ کبر سے بچنا اہم ہے اس لئے اس کو اجازت اس کی نہ دیجائے گی۔ اگر اجازت دے دیجائے تو بڑے مفاسد پیدا ہوں گے، جیسا کہ آج کل مشاہد ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ کامل کا اور حکم ہے اور ناقص کا اور، جس کو تمیز حاصل ہو چکی ہو وہ اس کے مطابق معاملہ کرے، اور جسے نہ حاصل ہوئی ہو تو اس کے لئے احتیاط اسی میں ہے کہ وہ زبان سے انکار نہ کرے، باقی اس تمیز کا حاصل کرنا ہے اختیاری شئی، یعنی انسان جب کہ نیت صحیح کر کے اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی برکت سے اس کے قلب میں صفائی پیدا فرما دیتے ہیں، اور اس کی وجہ سے اس کے اخلاق درست ہو جاتے ہیں۔ یعنی رذائل دور ہو جاتے ہیں اور صحیح اور اچھی چیزوں سے اس کو تعلق ولگاؤ سا ہو جاتا ہے، اور دین ودیانت کے ساتھ اس کو ایسی مناسبت ہو جاتی ہے کہ جہاں کوئی بات اس کے خلاف پیش آئی اور کوئی حال اس حال سے مختلف قلب میں گذرا تو یہ شخص

اس کو اپنے ذوق ووجدان سے محسوس کر لیتا ہے، اسی ذوق والے کو موفق کہتے ہیں۔ جس طرح حس ظاہر سے ہم مزہ کا احساس کرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ پانی کو پی کر یہ سمجھ لیتے ہیں کہ یہ پانی ہے، اور اس میں اگر شکر مل جائے تو یہ جانتے ہیں کہ یہ شربت ہے، اور پانی سے الگ ایک چیز ہے یا مثلاً کسی چیز میں نمک پڑا ہوا ہو اور دوسری چیز اس سے خالی ہو تو ہم چکھ کر دونوں کا فرق معلوم کر لیتے ہیں۔ اسی طرح سے اعمال کا بھی باطناً ایک مزہ ہوتا ہے جب کہ وہ اخلاص کے ساتھ ادا ہو رہے ہوں، اور جب اخلاص فوت ہو جائے تو اس کا دوسرا مزہ ہو جاتا ہے۔ اس کو موفق من اللہ پہچانتا ہے۔ چنانچہ ہوسکتا ہے کہ ابتداء میں کسی کے اندر کام میں اخلاص موجود ہو مگر بعد میں چل کر نہ رہ جائے۔ اسی طرح سے یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ابتداء میں کسی کام میں اخلاص نہ رہا ہو لیکن بعد میں چل کر پیدا ہو جائے۔

ف: سبحان اللہ! کیا ہی عمدہ کلام ہے، جو حضرت مصلح الامتؒ جیسا باذوق محقق عالم ہی بیان کرسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم منتسبین کو بھی اس علم وذوق کا حصہ نصیب فرمائے۔ (قمر الزمان)

بزرگان دین کے واقعات

اب ہم آپ کے سامنے بزرگان دین کے کچھ واقعات بیان کرتے ہیں جس سے معلوم ہوگا کہ یہ حضرات کس قدر مخلص ہوتے تھے کہ اگر کبھی ان کے کام میں اخلاص کے خلاف کوئی چیز شامل ہو جاتی تھی تو یہ حضرات فوراً محسوس کر لیتے تھے، اور اخلاص اور نفسانیت میں باہم تمیز فرما لیتے تھے۔

امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ کا واقعہ

اس سلسلہ میں سب سے پہلے امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ کا واقعۂ فتح بیت المقدس بیان کرتے ہیں وہ یہ کہ آپ کے دور خلافت میں مسلمانوں نے جب بیت المقدس کا محاصرہ کیا تو اہل شہر نے کہا کہ تم اپنے خلیفہ کو بلاؤ۔ ہماری کتاب میں ان کا حلیہ لکھا ہوا ہے، اگر مطابق ہو جائے گا ہم بغیر جنگ کئے ہی قلعہ کا دروازہ کھول دیں گے، اور شہر تمھارے حوالہ کر دیں گے۔ چنانچہ مسلمانوں کے سپہ سالار نے خلیفۃ المسلمین حضرت عمرؓ کے پاس یہ اطلاع بھیجی، اور آپ شام (یعنی بیت المقدس) کے لئے روانہ ہوگئے۔ بوقت روانگی آپ کا یہ حال تھا کہ پیوند لگے ہوئے معمولی کپڑے زیب تن فرمائے ہوئے تھے اور اونٹ پر سوار تھے۔ یہ دیکھ کر ساتھ کے مسلمانوں نے آپ سے درخواست کی کہ آپ مسلمانوں کے خلیفہ ہیں لہٰذا اچھے اور صاف کپڑے پہن لیں اور گھوڑے پر سوار ہو کر تشریف لے چلیں۔ حضرت عمرؓ نے لوگوں کی اس درخواست پر کپڑے بدل لئے اور اونٹ سے اتر کر گھوڑے پر سوار ہو گئے مگر ابھی چند قدم ہی چلے تھے کہ فرمانے لگے کہ بھائی میرا نفس ان چیزوں کی وجہ سے پھول رہا ہے۔ لاؤ میرے پرانے کپڑے اور میرا اونٹ میں اسی پر چلوں گا۔ اور یہ فرمایا کہ "**نحن قوم اعزنا اللہ بالاسلام**" یعنی ہم ایسی قوم ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے اسلام کے ذریعہ عزت دی ہے وہی ہمارے لئے کافی ہے۔ یہ فرمایا اور پھر وہی پیوند دار کپڑے پہن لئے اور اونٹ پر سوار ہو کر تشریف لے گئے۔ **اللہ اکبر**

دیکھئے! حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کے کہنے سننے کی وجہ سے اپنے کپڑے اور سواری کو بدلنے کو تو بدل لیا لیکن اس کی وجہ سے نفس میں جو تغیر پیدا ہوا اس کو فوراً محسوس فرما لیا اور خلوص اور نفسانیت میں امتیاز کر لیا۔ چنانچہ لباس وسواری کو بدل دیا پھر آپ کے اس اخلاص کی جو برکات ظاہر ہوئیں وہ معلوم ہیں کہ اسی کی وجہ سے قلعہ فتح ہو گیا۔

امیر المؤمنین حضرت علیؓ کا واقعہ

اور سنئے! مثنوی میں مولانا رومؒ نے حضرت علیؓ کا ایک واقعہ نقل کیا ہے وہ یہ کہ ایک مرتبہ جہاد میں کسی غیر مسلم پر آپ غالب آئے اور سینہ پر چڑھ گئے اور چاہا کہ تلوار سے اس کا کام تمام کر دیں۔ اس بے ادب نے آپ کے چہرۂ مبارک پر تھوک دیا۔ آپ نے اسی وقت تلوار پھینک دی اور اس کے سینے سے اتر آئے، اس کو بہت حیرت ہوئی اور اس چھوڑنے کا سبب پوچھا، آپ نے فرمایا کہ ؎

چوں خدو انداختی بر روئے من نفس جنبید و تبہ شد خوئے من
نیم بہر حق شد ونیمے ہوا شرکت اندر کار نبود روا

آپ نے فرمایا کہ جب تو نے میرے منہ پر تھوک دیا تو میرے نفس کو حرکت ہوئی اور میرا خلق حسن بگڑنے لگا، پس میرا یہ لڑنا کچھ تو اللہ کے واسطے رہ گیا اور کچھ نفس کے لئے ہو گیا اور حق تعالیٰ کی عبادت میں شرکت جائز نہیں ہے اور یہ بھی فرمایا کہ ؎

تو نگاریدہ کف مو نیستی آن حقے کردۂ من نیستی

نقش حق را ہم بامر حق شکن　　　برز جاجۂ دوست سنگ دوست زن

یعنی تو دست حق کا بنایا ہوا ہے اور حق تعالیٰ کا مملوک ہے میرا مملوک نہیں ہے، پس وہی تصرف جائز ہوگا جو باذن حق ہو۔ کیونکہ تو مصنوع حق ہے اور مصنوع حق امر حق سے ہی توڑنا چاہیئے اور دوست کے شیشہ کو دوست ہی کے پتھر سے مارنا چاہیئے۔

دیکھئے! یہ حضرت کے خلوص ہی کی برکت تھی کہ اپنے نفس پر قابو پاگئے، چنانچہ آپ کے اخلاص پر یہ ثمرہ مرتب ہوا کہ وہ کافر مسلمان ہوگیا، اور اپنے بہت سے خاندان والوں کو بھی مسلمان کرادیا۔ یہ واقعہ تو ایک جلیل القدر صحابی بلکہ امیر المؤمنین کا تھا۔ کتابوں میں لکھا ہے کہ سلاطین اسلام میں بھی بہت سے ایسے بادشاہ گذرے ہیں جن کو یہ تمیز حاصل تھی، اور وہ موقع پر خلوص کو نفسانیت سے تمیز دے لیتے تھے۔ چنانچہ اخلاق محسنی میں ہے کہ خراسان کے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ نے ایک مجرم کو سزا دینے کا حکم فرمایا۔ ادھر لوگوں نے کوڑے لگانے شروع کئے ادھر اس نے بے شرمی کی زبان کھولی اور بادشاہ کو گالیاں دینی شروع کی۔ خلیفہ نے حکم دیا کہ سزا بند کردیجائے اور اس کو رہا کردیا۔ مقربان شاہی میں سے ایک شخص نے پوچھا کہ حضور جو موقع اس بے حیا کو اور زیادہ سزا دینے کا تھا ایسے وقت میں معاف کردینے اور چھوڑ دینے کا کیا سبب ہوا، بادشاہ نے کہا کہ میں اس کو خدا کیلئے تنبیہ کرتا تھا، جب اس نے مجھے برا بھلا کہنا شروع کیا تو اس سے میرا نفس متغیر اور متأثر ہوا جی چاہا کہ اس سے بدلہ لوں لیکن پسند نہ آیا کہ حق تعالیٰ کے معاملہ میں نفس کو بھی شریک گردانوں کہ یہ صورت شیوۂ

اخلاص سے بعید ہے۔ کیونکہ جو شخص کوئی دینی عمل کرے اور اس میں کسی دنیوی غرض کو بھی شامل کرلے تو وہ اس کے ثواب سے محروم رہتا ہے۔

از سخنش آتش من تیز شد　　　کار الٰہی غرض آمیز شد

داعیٔ نفس چو بنمود رو　　　معنیٔ اخلاص نماند اندرو

کار کز اخلاص نہ شد بہرور　　　ترک چناں کار سزاوار تر

یعنی اس کی بدگوئی و بدکلامی سے میرے غصہ کی آگ بھی تیز ہوگئی، جس کیوجہ سے اللہ تعالیٰ کے لئے جو عمل تھا وہ غرض آمیز ہوگیا، اور جب نفس کا داعیہ ظاہر ہوا تو پھر اس کام میں اخلاص کہاں باقی رہا، جس کام میں اخلاص ہی نہ پایا جاوے ایسے کام کو ترک کردینا ہی بہتر ہے۔

ایک بزرگ کا واقعہ

احیاء العلوم میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک بزرگ کبھی فضول کلام نہ فرماتے تھے، ایک دن دریا کے کنارے جارہے تھے کہ سامنے سے ایک کشتی آتی ہوئی نظر پڑی اس پر کچھ مٹکے رکھے ہوئے تھے، کشتی والے سے پوچھ پڑے کہ اس میں کیا ہے؟ اس نے بڑی تیزی سے کہا کہ سلطان کی شراب جارہی ہے۔ کرلو جو کرنا ہو، ان بزرگ نے کشتی والے سے کہا کہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے اس نے کہا ڈنڈا۔ کہا ذرا دیر کے لئے مجھے تو دیدو، اس نے فوراً دیدیا، انھوں نے اس سے ڈنڈا لے کر ایک ایک مٹکے کو توڑنا شروع کیا یہاں تک کہ تیس میں سے انتیس مٹکے توڑ ڈالے اور ایک کو چھوڑ دیا۔ بادشاہ کو اس کی اطلاع ہوئی ان کو طلب کیا، کہتے

ہیں کہ نہایت ہی جابر بادشاہ تھا، لوہے کی کرسی میں بیٹھ کر لوہے کا گرز ہاتھ میں لے کر دربار کرتا تھا۔ ان بزرگ سے پوچھا کہ آپ نے ان مٹکوں کو توڑا ہے؟ کہا ہاں۔ اس نے کہا کہ آپ کو کس نے محتسب (کوتوال) بنایا ہے؟ کہا کہ جس نے آپ کو بادشاہ بنایا ہے۔ یہ سن کر بادشاہ نے سر نیچا کر لیا، ذرا دیر کے بعد پھر ان سے پوچھا کہ اچھا یہ بتلایئے کہ آپ کو کس جذبہ نے اس فعل پر آمادہ کیا؟ فرمایا کہ محض امیر المؤمنین کی خیر خواہی نے، اس لئے کہ اگر میں یہ دیکھوں کہ امیر المؤمنین کی جانب کوئی موذی جانور مثلاً سانپ یا بچھو چلا آرہا ہے تو میرا فرض ہے کہ میں امیر المؤمنین کو بچاؤں۔ اسی طرح میں نے جب یہ دیکھا کہ ایسی شئ امیر المؤمنین کی طرف جارہی ہے جس کے ارتکاب کی وجہ سے قیامت میں سخت مواخذہ ہوگا تو امیر المؤمنین کی خیرخواہی نے مجھے مجبور کیا کہ میں امیر المؤمنین کو اس سے بچالوں۔ یہ سن کر وہ پھر سرنگوں ہوگیا اور دیر تک سر جھکائے رہا پھر اس نے پوچھا کہ اچھا ایک بات اور بتلا دیجئے وہ یہ کہ جب توڑنا ہی تھا تو سارے مٹکے توڑ ڈالے ہوتے، ایک کو کیوں چھوڑ دیا ان بزرگ نے فرمایا کہ جب آپ نے پوچھا ہی ہے تو بتلانا ضروری ہے۔ وجہ یہ ہوئی کہ جب تک میں انتیس کو توڑتا رہا میرے قلب کی حالت نہایت عمدہ تھی۔ بغض فی اللہ اور نصح مسلم کا جذبہ کارفرما تھا اور قلب میں ایسی قوت محسوس کرتا تھا کہ اگر ساری روئے زمین شراب کے مٹکوں سے بھری ہوتی تو سب کو توڑ دیتا، لیکن جب تیسویں پر پہنچا تو نفس نے کچھ حصہ لے لیا یہ خیال آگیا کہ تم نہی عن المنکر کے باب میں اس قدر جری ہو کہ حاکم وقت کی پروا نہیں کرتے، بس اس خیال کا آنا تھا کہ میں نے

کہا کہ یہ تو نفسانیت آگئی للٰہیت رخصت ہوگئی اس لئے اس کو چھوڑ دیا۔

بادشاہ پر ان بزرگ کی اس گفتگو کا بہت اثر ہوا اس نے کہا اچھا آج سے تم کو محتسب بناتا ہوں، انھوں نے فرمایا کہ معاف کیجئے، آپ جب بنا سکتے ہیں تو یہ منصب لے بھی سکتے ہیں لہٰذا مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ کہہ کر وہاں سے چلے گئے، اور جب تک وہ بادشاہ زندہ رہا اس شہر میں آئے ہی نہیں۔

دیکھا آپ نے بزرگوں کو اور اللہ والوں کو ان کے اخلاص کی وجہ سے قلب میں ایک وجدانی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے، جس سے ان کو للٰہیت اور نفسانیت میں تمیز حاصل ہوجاتی ہے، میں کہتا ہوں کہ جب اخلاص حاصل کرنا ضروری ہے اور نفسانیت سے بچنا فرض ہے تو پھر ہر مسلمان کو اس امتیاز کو سمجھنا اور اپنے قلب میں پیدا کرنا بھی ضروری ہے۔ بزرگان دین کے یہاں یہی کام ہی ہوتا رہا ہے کہ وہ اخلاص پر بحث کرتے ہیں، اور اپنے لوگوں میں اسی چیز کے پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کی ضرورت سے تو آپ کو بھی انکار نہ ہوگا۔ اس لئے کہ آپ نے دیکھا کہ اس عابد ناپارسا کے پاس طاعت اور عبادت کی کمی نہیں تھی، کمی جو تھی تو اخلاص کی تھی۔

اور سنئے! مولوی عبد الکریم صاحب گمتھلوی نے ایک واقعہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا بیان فرمایا کہ دہلی کا سفر پیش آیا تو فرمایا کہ کپڑے لے لو وہیں چل کر بدل لیں گے، اور راستہ کے لئے تو یہی کافی ہے۔ مولوی صاحب فرماتے تھے کہ دہلی کے بعد بھی حضرت نے اپنے کپڑے نہیں بدلے۔ انھیں میلے کپڑوں میں وعظ فرمایا۔ حضرت کو کچھ (عجب وغیرہ کا) خیال آگیا ہوگا اس لئے تبدیل نہیں فرمائے۔

دوسراواقعہ سنئے:

حضرت مولانا تھانویؒ نے ایک دفعہ حضرت مولانا شیخ الہند محمود الحسن دیوبندیؒ کو کانپور بلایا، حضرت سے وعظ کی درخواست کی گئی۔ حضرت نے منظور فرمایا اور نہایت ہی عمدہ تقریر فرمائی، ایسی کہ بڑے بڑے معقولی سن کر حیران اور ششدر رہ گئے۔ اتنے میں مولوی لطف اللہ صاحب علیگڈھی بھی آگئے۔ حضرت نے وعظ بند فرمادیا۔ لوگوں کو افسوس ہوا کہ آج ہی تو موقع تھا مولوی صاحب آگئے تھے۔ حضرت کی تقریر بھی نہایت فاضلانہ ہورہی تھی۔ کاش حضرت سلسلہ تقریر جاری رکھتے تو مولوی صاحب کو بھی کچھ سننے کا موقع مل جاتا۔ یہاں تک کہ کسی نے ہمت کر کے حضرت دیوبندی سے بھی اس کا ذکر کردیا۔ حضرت نے صاف فرمایا کہ بھائی یہی خیال تو مجھے بھی ہوا تھا اس لئے میں نے تقریر بند کردی کہ اب تو یہ تقریر اللہ کے لئے نہ ہوگی۔

ان واقعات سے آپ نے اندازہ کیا کہ بزرگان دین کی کس قدر توجہ خود اپنے نفس پر رہتی ہے، دوسروں کو کچھ کہنے سننے کے بجائے ہر وقت یہ حضرات اپنا ہی محاسبہ کرتے رہتے ہیں۔

آخر میں بطور خلاصہ عرض کرتا ہوں کہ:

﴿۱﴾ آدمی کو چاہئے کہ اپنے ہی عیوب پر نظر کرے دوسروں کو حقیر وذلیل اور اپنے سے کمتر سمجھنا نہایت بری بات ہے، اور جس وقت تک انسان کے پیش نظر اپنے عیوب نہیں ہوتے وہ دوسروں کے عیوب پر نظر کرتا ہے لیکن جب اپنے معائب سامنے آجاتے ہیں تو پھر دوسروں کی تحقیر قلب سے نکل جاتی ہے۔

اوروں پہ معترض تھے لیکن جب آنکھ کھولی
اپنے ہی دل کو ہم نے گنج عیوب پایا

ف: اسی مضمون کو حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ نے اپنے شعر میں اس طرح واضح فرمایا۔

کھل گئی جب سے چشم بصیرت
اپنی نظروں سے خود گر گئے ہم

(محمد قمر الزمان)

﴿۲﴾ جو گنہگار کہ اپنے گناہوں پر شرمسار ہو اور اللہ تعالیٰ کے عذاب کا خوف اور اس کی مغفرت کی رجا اس کو حاصل ہو وہ عاصی اس عابد ناپارسا سے بہتر ہے، جسے اپنی عبادت پر تکیہ ہو۔

گنہگار اندیشناک از خدائے
بہ از پارسائے عبادت نمائے

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرنے والا گنہگار بندہ اس پارسا سے بہتر ہے، جو اپنی عبادت میں ریا کرتا ہے۔

یہی مطلب ہے بزرگوں کے اس ارشاد کا کہ "**العاصی خیر من المدعی**" اور اسکا کہ۔

زاہد غرور داشت سلامت نبرد راہ
رند از رہ نیاز بدار السلام رفت

ترجمہ: زاہد اپنے اندر غرور اور پندار رکھنے کیوجہ سے راستہ صحیح وسالم طے نہ کر سکا۔ اور رند یعنی آزاد شخص عجز ونیاز کی راہ سے دار السلام میں داخل ہوگیا۔

﴿۳﴾ اصل طریق تواضع ہے، یہی انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے اور ہر زمانہ میں صالحین امت کا اس پر عمل رہا ہے، جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا ''انا البائس الفقیر'' الخ کی تشریح سے ظاہر ہوا۔

﴿۴﴾ تواضع اور بغض فی اللہ میں منافات نہیں ہے، دونوں جمع ہو سکتے ہیں۔ تواضع باقی رکھنے کے لئے اپنی حیثیت پیش نظر رکھے ''ایاز قدر خود بشناس'' (ایاز اپنی قدر پہچانو) اور بغض کرنے کیلئے دوسرے کی مصلحت سامنے کرے یعنی یہ سمجھے کہ یہی طریقہ اس کے حق میں نافع ہوگا، پس تواضع اپنے اعتبار سے کرے اور بغض اس کے اعتبار سے ان دونوں میں کیا تضاد ہے؟

﴿۵﴾ البتہ یہ ضرور ہے کہ کبھی کبھی بغض للنفس کا اشتباہ بغض فی اللہ کے ساتھ ہو جاتا ہے یعنی ہوتا تو ہے نفسانی غصہ اور نفس یہ دھوکا دیتا ہے کہ یہ بغض فی اللہ ہے۔ تو اس مغالطہ سے نکلنے کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنے اندر امتیاز پیدا کرے۔ بزرگوں نے اس کو پیدا کیا ہے اور نفسانیت اور خلوص میں اس کے ذریعہ تمیز دی ہے۔ ہر شخص اس کا مکلّف ہے کہ یہ تمیز پیدا کرے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ تمیز اہل تمیز کی صحبت سے ہی پیدا ہو سکتی ہے۔ اور جب تک آدمی کے اندر یہ چیز نہ پیدا ہو وہ بغض فی اللہ کا اظہار زبان سے نہ کرے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ نفس شامل ہو جائے اور اس کو خبر بھی نہ ہو۔ پس اس کا ترک اس درجہ مضر نہیں جتنا کہ نفسانیت کی آمیزش اور کبر و تکبر اور دوسرے کی تحقیر مضر ہے، اس لئے انسب اور احوط اس کا ترک ہی کر دینا ہے جس طرح سے امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں جو شخص مواقع عنف و لین کو نہ پہچانتا ہو اس کے لئے نرمی ہی متعین ہے۔

بس اب اسی دعا پر مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

اللهم انک تسمع کلامی وتریٰ مکانی وتعلم سری وعلانیتی لایخفیٰ علیک شیء من امری وانا البائس الفقیر المستغیث المستجیر الوجل المشفق المقر المعترف بذنبی. اسألک مسألة المسکین وابتهل الیک ابتهال المذنب الذلیل وادعوک دعاء الخائف الضریر ودعاء من خضعت لک رقبته وفاضت لک عبرته وذل لک جسمه ورغم لک انفه.

(فیض القدیر ج۲ ص۱۱۷)

یا اللہ! تو سنتا ہے میری بات کو اور دیکھتا ہے میری جگہ کو اور جانتا ہے میرے پوشیدہ اور ظاہر کو، چھپی نہیں رہ سکتی تجھ سے میری کوئی بات، اور میں ہوں مصیبت زدہ محتاج، فریادی، پناہ جو، ہراساں، اقرار کرنے والا ماننے والا اپنے گناہ کا سوال کرتا ہوں تجھ سے سوال بیکس کا سا اور گڑگڑاتا ہوں تیرے سامنے گڑگڑانا گنہ گار ذلیل کا سا اور طلب کرتا ہوں تجھ سے طلب کرنا خوف زدہ آفت رسیدہ کا سا، اور طلب کرنا اس شخص کا سا کہ جھکی ہوئی ہو تیرے سامنے گردن اسکی اور بہہ رہے ہوں آنسو اسکے اور فروتنی کئے ہوئے ہو تیرے سامنے اور رگڑتا ہو تیرے سامنے ناک اپنی۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم

بحرمة سیدنا النبی الکریم صلی الله علیه وسلم.

اعتذار واستدعا

آج بتاریخ ۱۰؍محرم الحرام ۱۴۲۹ھ بمکان بیت الاذکار وصی آباد یہ حقیر محمد قمرالزمان الہ آبادی اس معرکۃ الآراء کتاب کی تسہیل وتوضیح سے فارغ ہوا، اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرمائے، اور امت کے عوام وخواص طالبین وسالکین سب کے لئے مفید بنائے۔ طریق وسلوک کے وضوح کے لئے بقعۂ نور بنائے۔ آمین

اس سلسلہ میں جو اس احقر سے کوتاہی وقصور ہوا جس کا اس حقیر کو بجا طور پر اعتراف ہے، اس لئے کہ اس کتاب میں فارسی عربی مندرجہ عبارتوں کی اصل کتابوں سے مراجعت اور حدیثوں کی تعلیق وتخریج کا حق ادا نہ ہوسکا۔ اللہ اس کو معاف فرمائے، اور آئندہ اس کتاب کی اور حضرت مصلح الامتؒ کے رسالوں اور کتابوں پر (جیسا کہ عزم وارادہ ہے) محنت کرنے اور اس کو ہر طرح محقق کرنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین

اے اللہ! یہ تاریخ چونکہ بہت سے اہم واقعات پر مشتمل ہے فرعون اسی دن دریا میں غرق کیا گیا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نجات پائی۔ اللہ! آج کے دن کے اخیر لمحات میں بصد عجز ونیاز یہ دعا ہے کہ اس وقت کے فرعونوں کو غرق فرمائے، اور برباد فرمائے، جو اسلام اور اہل اسلام کو نیست ونابود کرنا چاہتے ہیں۔ اور امت کے تمام علماء ومشائخ اور جملہ مسلمین ومسلمات‘ تمام مساجد‘ مدارس‘ دینی جماعتوں اور اداروں کی کامل حفاظت فرمائے، اور اپنا فضل وکرم ہم سب پر مبذول فرمائے۔ **ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم۔**

بیت الاذکار، وصی آباد، الہ آباد

قبیل مغرب ۱۰؍محرم الحرام ۱۴۲۹ھ